www.allurdu.com

دوسرا حصہ

دھڑکنیں

وقت گزرتا گیا۔ شاہراہِ حیات پر زندگی کے سادہ، رنگین اور دلفریب نقوش ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہوتے گئے۔ سلیم اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور کے ایک کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ مجید میٹرک کے امتحان میں فیل ہونیکے بعد فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ سلیم کے گاؤں کے دو اور ساتھی گلاب سنگھ اور رام لال میٹرک سے پہلے ہی اسکول چھوڑ چکے تھے۔ رام لال کو شہر کے کارخانے میں منشی کی جگہ مل گئی تھی اور گلاب سنگھ کاشتکاری میں اپنے باپ اور چچوں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

پڑوس کے گاؤں میں بلونت سنگھ اور کندن لال امرتسر کے کسی کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ پرائمری سکول والے گاؤں کے ماسٹر کا لڑکا احمد ضلع کے کسی دفتر کا کلرک اور پٹواری کا لڑکا معراج الدین ریلوے میں بابو بن چکا تھا۔

ڈاکٹر شوکت کی تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ ارشد کے ساتھ سلیم کی خط و کتابت رہی۔ اس کے بعد سلیم کو چند خطوط کا جواب نہ آیا اور خط و کتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا، زبیدہ، امینہ اور صغریٰ کے نام عصمت کے خطوط آتے رہے لیکن اُن کی طرف سے باقاعدہ جواب نہ جانے پر وہ بھی خاموش ہو گئی۔

کالج میں سلیم کی دلچسپیوں کے ہزاروں اسباب تھے۔ وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جنہیں ہر ماحول میں دوست اور قدردان مل جاتے ہیں۔ ہوسٹل میں اس کی

www.allurdu.com

شگفتگی اور زندہ دلی مشہور تھی۔ طلباء کی کسی محفل میں کالج کے ذہین اور ہونہار لڑکوں کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتیں تو سلیم کا ذکر بھی ضرور آتا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اس نے چند نظمیں اور کہانیاں لکھیں تھیں جنھیں وہ چھپا کر رکھا کرتا تھا لیکن وہ خصائل جو قدرت کے عطا کردہ ہوں، دیر تک پوشیدہ نہیں رہتے۔ سلیم نے جھجکتے جھجکتے اپنی ایک نظم کالج کے میگزین میں بھیج دی۔ ایڈیٹر نے نہ صرف اسے شائع کیا بلکہ اس کی تعریف میں ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا۔ یہ اس کی شہرت کا آغاز تھا۔ اس کے بعد اس نے دیہاتی زندگی کے متعلق ایک افسانہ لکھا جسے نظم سے کہیں زیادہ پسند کیا گیا۔

اسی افسانے کی بدولت وہ اختر کے ساتھ متعارف ہوا۔ اختر اس سے ایک جماعت آگے تھا اور اس کا شمار کالج کے ذہین ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ کالج کے میگزین کے علاوہ دوسرے ادبی رسائل اور اخبارات کے لیے سیاسی مضامین لکھا کرتا تھا۔

وہ چھریرے بدن کا ایک مختصر انسان تھا لیکن اس کی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھوں اور بھنچے ہوئے ہونٹوں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ ہوسٹل میں وہ بہت کم لڑکوں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ کھانے کی میز پر لڑکے ایک دوسرے کی معمولی شرارتوں پر قہقہے لگاتے لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لڑکے کسی مسئلے پر بحث چھیڑ دیتے اور ہر ایک دوسرے کی سننے کی بجائے اپنی سُنانے کے لیے زیادہ بے قراری ظاہر کرتا۔ اختر کو اگر موضوع سے دلچسپی نہ ہوتی تو چپکے سے کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا لیکن جب کبھی وہ بولتا، سُننے والے یہ محسوس کرتے کہ وہ بحث میں حصّہ لینے کی بجائے اپنا فیصلہ سُنا رہا ہے۔ کبھی کبھی کالج میں علمی ادبی اور سیاسی موضوعات پر تقریریں ہوتیں تو اختر ان میں بھی حصّہ لیتا اور موضوع کی موافقت اور مخالفت میں اس کی تقریر فیصلہ کن سمجھی جاتی۔

سلیم کے ساتھ اختر کی پہلی ملاقات بہت مختصر تھی۔ ایک دن وہ تیزی سے ہوسٹل

کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا اور اختر اوپر آ رہا تھا۔ موڑ پر دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ اختر کے ہاتھ سے کتابیں گر پڑیں۔

"اوہو معاف کیجیے!" سلیم نے پریشان سا ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

سلیم نے جلدی سے کتابیں اٹھا کر اسے پیش کیں اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اختر نے کہا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں لیٹر بکس میں خط ڈالنے جا رہا ہوں۔"

"بھئی اگر تکلیف نہ ہو تو ایک خط میرا بھی لے جاؤ۔ میں نے کل سے لکھ رکھا ہے۔ باہر نکلتا ہوں تو یاد نہیں رہتا۔"

"بہت اچھا لائیے!" سلیم اختر کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اختر نے میز سے خط اٹھاتے ہوئے کہا — "غالباً کالج میگزین میں "آخری مسکراہٹ" کے عنوان سے آپ ہی کا افسانہ شائع ہوا ہے!"

"جی میں نے یونہی لکھ دیا تھا۔"

"مجھے آپ کی طرزِ تحریر بہت پسند آئی ہے۔ افسانے کا پلاٹ بھی بہت دل کش تھا لیکن مجھے سب سے زیادہ اس کے وہ حصّے پسند ہیں جن میں آپ نے گاؤں کے مناظر پیش کیے ہیں۔ شاید اس لیے کہ میں گاؤں کی زندگی سے قطعاً ناآشنا ہوں۔ دیہاتی زندگی کے متعلق آپ نے اور بھی کچھ لکھا ہے؟"

سلیم نے کہا۔ "گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کا عنوان ہے "میرا گاؤں" وہ کافی طویل ہے۔ آپ کو کبھی فرصت ہو تو میں دکھاؤں گا!"

"بھئی میں ضرور پڑھوں گا اگر آپ کے پاس ہے تو ابھی دے جائیے۔ مجھے اس

www.allurdu.com

وقت کوئی کام نہیں!"

سلیم نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اس میں بعض واقعات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر آپ ہنسیں گے۔"

اختر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "پھر تو میں ضرور پڑھوں گا۔ لائیے!"

سلیم نے اپنے کمرے میں سے ایک کاپی لا کر اختر کے ہاتھ میں دے دی اور خط ڈالنے کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

شام کے قریب اختر پہلی بار سلیم کے کمرے میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں وہ کاپی تھی جو دوپہر کے وقت سلیم نے اُسے دی تھی۔ "لیجیے سلیم صاحب!" اس نے کہا۔ "میں نے پڑھ لیا آپ کا مضمون!"

"تشریف رکھیے!" سلیم نے کہا۔

اختر کرسی پر بیٹھ گیا اور سلیم اپنے دل میں مسرت اور اضطراب کی ملی جلی دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ اختر کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیلتی گئی اور سلیم کے خدشات دُور ہوتے گئے۔

وہ بولا۔ "سلیم صاحب! آپ کا مضمون بے حد دلچسپ تھا۔ میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں اس گاؤں میں گھوم رہا ہوں اور وہ رمضان اگر آپ کے گاؤں کا کوئی جیتا جاگتا آدمی ہے تو میں اسے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھوں گا۔ آپ اس مضمون کو اشاعت کے لیے ضرور بھیجیے!"

یہ ایک خوش گوار ابتدا تھی، اس کے بعد سلیم اور اختر ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ سلیم کو اختر کی شخصیت میں ایک دوست، ایک نگران اور ایک رہنما مل چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کالج کی لائبریری سے کتابیں منتخب کرتا۔ اس کے ادبی کارناموں کے عیوب و محاسن کے متعلق بے لاگ رائے دیتا۔ علی الصباح اُسے اپنے

ساتھ پڑوس کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے اور قرآن کا درس سننے کے لیے لے جاتا۔ شام کو وہ کبھی کبھی سیر کو نکل جاتے۔

اختر ماضی اور حال کا موازنہ کرنے کے بعد قوم کے مستقبل کے متعلق بے چین رہا کرتا تھا۔ اس کے خدشات کبھی کبھی سلیم کو بھی پریشان کر دیتے لیکن وہ احساس کی اس شدت سے آشنا نہ تھا جو اختر کو مضطرب رکھا کرتی تھی۔ سلیم نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں نکھری ہوئی بہاریں تھیں، اس میں قوس کے رنگ تھے، اس میں دُھوپ اور چھاؤں کا امتزاج تھا۔ وہ اگر ایک لمحہ کے لیے سنجیدہ ہوتا تو فوراً ہی قہقہہ لگانے کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ وہ ابھی تک ان دھڑکنوں سے ناآشنا تھا جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں۔

انتہائی اُنس اور محبت کے باوجود سلیم کے لیے کبھی کبھی اختر کی صحبت بوجھل سی ہو جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب قوم کے سیاستدانوں اور لیڈروں پر نکتہ چینی کرنے کے بعد آنے والے دور کی بھیانک تصویریں پیش کرتا۔ سلیم یہ محسوس کرتا کہ اختر خفا ہے۔ ساری دنیا سے خفا ہے اور پھر اپنے گاؤں کا کوئی واقعہ یا کوئی لطیفہ سنا کر گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا لیکن اختر کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا کہ آج اس کے کان ایسی باتوں کے لیے بند ہیں۔ اس کی خشمگیں نگاہیں سلیم کو خاموش کر دیتیں۔ وہ کہتا۔ "سلیم! ہم ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ہم پر ایک بہت ہی نازک وقت آنے والا ہے۔ اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کے لیے جس اجتماعی شعور اور کردار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم میں مفقود ہے۔ اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں ہمارا وہی حشر نہ ہو جو اسپین میں ہو چکا ہے۔"

اس قسم کی تقریریں سلیم کو پریشان کر دیتیں اور رات کے وقت جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا تو اس کے کانوں میں اختر کے الفاظ گونجتے۔ کچھ دیر وہ بے چینی میں کروٹیں

www.allurdu.com

لیتا۔ پھر اس کے منتشر خیالات اپنے گاؤں پر مرکوز ہو جاتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ کہیں بھیانک صحرا سے نکل کر نخلستان میں پہنچ گیا ہے۔ وہ نخلستان جہاں زندگی کی دائمی مسکراہٹیں اور قہقہے ماضی، حال اور مستقبل کی قیود سے آزاد ہیں۔ وہ سوچتا، اسے چڑیوں کے چہچہے سُنائی دیتے، پچھلے پہر کھیت میں ہل چلانے والے کسان کے الغوزے کی آواز سنتا۔ جھیل کے شفاف پانی سے کنول کے پھول توڑتا۔ آم کے درخت کے ساتھ جھولا جھولتا اور گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر گھوڑا دوڑاتا، کبھی کبھی وہ سپنوں کی وادی کے ان گوشوں تک پہنچ جاتا جہاں زندگی کے ابتدائی نقوش وقت کی ریت میں دب چکے تھے اور جب وہ میٹھے اور سہانے سپنوں کے بعد بیدار ہوتا تو اختر کی باتیں اسے وہم معلوم ہوتیں:

لیکن حال کے آئینے پر مستقبل کے چہرے کے جو خدوخال ظاہر ہو رہے تھے، وہ تدریجاً بھیانک ہوتے گئے۔ زندگی کے اُفق پر گرد و غبار جسے سلیم محض وہم سمجھتا تھا نمایاں ہوتا گیا۔ اس نے بچپن میں اس قسم کی کہانیاں سنی تھیں کہ ایک مسافر کسی شہر میں داخل ہوا۔ بازاروں اور گلیوں میں خوب چہل پہل تھی۔ کہیں برات کی دھوم دھام تھی اور کہیں مداریوں اور بازیگروں کے تماشے تھے۔ وہ ان دلچسپیوں میں کھو گیا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے لیکن اچانک افق پر گرد و غبار کے بادل اٹھے اور آن کی آن میں ایک تاریک آندھی چاروں طرف چھا گئی ـــــ لوگ سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مسافر بدحواس ہو کر ان سے پوچھ رہا تھا۔ "تم کیوں بھاگ رہے ـــــ ؟" لیکن کسی نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ لوگ اس قدر خوفزدہ تھے کہ کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ بچے، عورتیں، جوان اور بوڑھے سب چیختے چلاتے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اس سراسیمگی کی حالت میں کئی بچے، بوڑھے اور اپاہج دوسروں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔

مُسافر خوفزدہ ہو کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اچانک آندھی رُک گئی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں لیکن مسافر حیران تھا کہ طوفان گزر جانے کے باوجود لوگوں کی سراسیمگی میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ پہلے سے زیادہ بدحواس ہو کر ایک دوسرے کے اُوپر گر رہے تھے۔ اچانک ایک مہیب دیو نمودار ہوا۔ اس کا رنگ سیاہ اور آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں۔ اس کے بڑے بڑے دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی اور سر پر بالوں کی جگہ ہزاروں سانپ لہرا رہے تھے اور زمین اس کے پاؤں تلے لرز رہی تھی۔ اس کے قہقہے بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہولناک تھے۔ وہ بچوں، عورتوں اور آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر ہوا میں اُچھالتا اور جب وہ گرتے تو انھیں اپنے پاؤں سے کچل دیتا۔ نوجوان لڑکیاں چیخیں مار مار کر کنوؤں، نہروں اور تالابوں میں کُود رہی تھیں۔ بعض لوگوں نے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر رکھے تھے لیکن اس کے مضبوط ہاتھوں کے سامنے یہ دروازے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ وہ انھیں ہاتھ پاؤں کی ایک ہی ضرب سے توڑ ڈالتا اور پھر قہقہہ لگا کر کہتا۔ "اب تم کہاں جا سکتے ہو، آج میں آزاد ہوں۔ سالہا سال قید میں رہنے کے بعد آج پہلی مرتبہ مجھے آزادی ملی ہے۔ قید میں میرے ہاتھ پاؤں مضبوط زنجیروں سے جکڑے ہوتے تھے اور میں بے بسی کی حالت میں دانت پیستا رہا۔ میرے کان خوبصورت لڑکیوں کی چیخیں سننے کے لیے بے قرار تھے۔ میرے ہاتھ تمہیں ہوا میں اچھالنے اور میرے پاؤں تمہیں مسلنے کے لیے بے چین تھے ـــــ تم چیخ رہے ہو ـــــ لیکن قید خانے کی تنہائیوں میں میری چیخوں کا تصور کرو۔ میں تمہاری ہڈیوں کے تصور میں قید خانے کی آہنی سلاخوں کو مروڑا کرتا تھا اور میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ جایا کرتے تھے۔ اس وقت میں یہ عہد کیا کرتا تھا کہ آزادی ملتے ہی جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گا۔

www.allurdu.com

میں آج آزادی کا ناچ ناچوں گا۔ میرے لیے اپنی لاشوں کی سیج بچھا دو!"

بھارت ماتا ہندو سامراج کے اس عفریت کو جنم دے چکی تھی۔ جس کے ذہن میں آزادی کا مفہوم دس کروڑ مسلمانوں کو حقوقِ آزادی سے محروم کرنا تھا۔ وہ سانپ اپنے بل سے سر نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔ جس کے زہر نے صدیوں پیشتر اچھوت کی رگوں سے زندگی کی حرارت چھین لی تھی۔ صدیوں پیشتر ہندو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اچھوتوں کا بلی دان دیا کرتا تھا اور دیوتاؤں نے اُسے اچھوتوں کی بستیاں جلانے اور ان کے جھونپڑوں کی راکھ پر اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ صدیوں تک بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کے مظالم برداشت کرنے کے بعد اچھوت کی قوتِ مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ وہ برہمن اور اُونچی ذات کے ہندوؤں کی تقدیس کے احترام میں اپنے تمام انسانی حقوق سے دست بردار ہو چکا تھا۔

لیکن اب ہندو کے سامنے دس کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ تھا اور یہ وہ قوم تھی جس نے اس ملک پر صدیوں تک حکومت کی تھی۔ ہندو نے اچھوت کو ورن آشرم کی آخری کڑی بنانے سے پہلے اپنی تلوار سے مغلوب کیا تھا لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں محمد بن قاسمؒ کے زمانے سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے زمانے تک یہ تلوار بے اثر ثابت ہوئی۔ پانی پت کی رزمگاہیں ہندو کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھیں کہ تلوار کی جنگ میں وہ اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ پرانے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر ایک نئے دیوتا کی اعانت کا طلب گار ہوا۔ یہ نیا دیوتا انگریز تھا۔

انگریز نے اس وقت ہندوستان میں قدم رکھے جب مسلمانوں کی سطوت کے ستون کھوکھلے ہو چکے تھے۔ تاہم ان کی آخری قوتِ مدافعت جو بنگال میں سراج الدولہ اور جنوبی ہند میں سلطان ٹیپوؒ کی شخصیتوں میں ظاہر ہوئی، انگریز کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ اس قوم کی خاکستر میں ابھی تک چنگاریاں موجود ہیں۔ چنانچہ

اس نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ہندو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ١٨٥٧ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان انگریز کی نظر میں اور زیادہ معتوب ہو گیا اور وہ چکی کے دو پاٹوں، انگریز اور ہندو کے درمیان پسنے لگا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے اندر مغربی طرز کی جمہوریت کے تصور سے ہندو کی وہ پُرانی جبلّت زندہ ہو رہی تھی جس نے برہمن کی تقدیس کا چولا پہن کر نیچ ذات کو ہمیشہ کے لیے حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا تھا۔ ہندو جانتا تھا کہ ایک مرکز کے تحت جمہوری نظامِ حکومت میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو بھی سیاسی اور اقتصادی اچھوت کا درجہ قبول کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ چنانچہ ہندو ورن آشرم کی جگہ ہندی نیشنل ازم نے لے لی ؂

———— ✳ ————

ہندی نیشنل ازم آل انڈیا کانگریس کا لبادہ پہن کر میدان میں آیا۔ اس نئی تحریک کے اغراض و مقاصد منوجی کے ورن آشرم سے مختلف نہ تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ منوجی کی تحریک نے برہمن کی تقدیس کا سہارا لیا تھا اور کانگریس کی تحریک ہندو اکثریت کے بل بوتے پر رام راج قائم کرنا چاہتی تھی۔ منوجی کے ہاتھ میں تیز چھری تھی اور اس نے بلا تامل اچھوتوں کو ذبح کر کے برہمن کے قدموں میں ڈال دیا لیکن گاندھی کی آستین میں ایک زہر آلود نشتر تھا جسے استعمال کرنے سے پہلے وہ مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ لینا ضروری سمجھتا تھا۔ منوجی نے اچھوت کو دھتکارا تھا لیکن گاندھی کو خطرہ تھا کہ یہ قوم جسے نابود کرنے کا کام سماج کے مقدس دیوتاؤں نے اسے سونپا ہے، سو رہی ہے، مردہ نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ اپنا زہر آلود نشتر آزمانے سے پہلے اُنھیں بیہوشی کے ٹیکے لگانا ضروری سمجھتا تھا۔ گاندھی کا طریقِ کار وہی ہوتا جو منو کا تھا، تو

www.allurdu.com

مؤرخ شاید پانی پت کی ایک اور جنگ دیکھتے اور دہلی کے لال قلعے پر جو جھنڈا انگریز کے جانے کے بعد لہرایا جاتا اس پر اشوکا کے چکر کی بجائے محمد بن قاسمؒ کی تلوار کا نشان ہوتا۔ گاندھی نے ہندو اکثریت کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اچھوتوں کے لیے بھارت ماتا کی گود کشادہ کر دی۔ ان کے لیے چند مندروں کے دروازے کھل گئے۔ انھیں سماج کے مقدس بیٹوں کے چند کنوئیں بھرشٹ کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ صدیوں کے بعد ایک کروٹ لے کر پھر بھارت ماتا کے قدموں میں سو گئے ـــــ مسلمانوں کا مدافعانہ احساس کچلنے کے لیے گاندھی نے انھیں آزادی کا سراب دکھایا۔ تحفظات کا مطالبہ کرنے والوں کو تنگ نظر، فرقہ پرست انگریز کے ایجنٹ اور وطن کی آزادی کے دشمن کہا گیا۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو اس سراب کی حقیقت سے واقف تھے۔ جو گاندھی کی آستین میں چھپے ہوئے خنجر کو اپنی شاہ رگ کے قریب آتا دیکھ رہے تھے، جو ہندو مقاصد کی چٹان کو بتدریج پانی سے ابھرتا ہوا دیکھ کر قوم سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری ناؤ رام راج کی اس خطرناک چٹان کی طرف دھکیل رہا ہے جس کے ساتھ ٹکرا کر یہ پاش پاش ہو جائے گی اور تم اچھوتوں کی طرح موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

لیکن ایسی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ گول میز کانفرنس نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ کانگریس جس انقلاب کا نعرہ لگا رہی ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت کے بعد مسلمان اپنا سیاسی مستقبل ہندو اکثریت کو سونپ دیں۔

کانگریس نے کئی بار حکومت کے ساتھ سودا کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ انگریز اقلیتوں کو نظر انداز کر کے اس کی واحد نمائندگی کو تسلیم کرلے لیکن انگریز دس کروڑ مسلمانوں کے وجود سے قطعی انکار نہ کرسکا۔ بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کی تسکین کے لیے دس کروڑ مسلمانوں پر اپنی

سنگینوں کا پہرا بٹھانے میں اُسے کوئی مصلحت نظر نہ آئی۔ انگریز کے متعلق کانگرس کی پالیسی میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ گاندھی جی کی آتما نے کئی چولے بدلے۔ لیکن مسلمانوں کے متعلق اُن کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ تاہم آزادی کے نعروں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ مسلم عوام کا جوش و خروش ابھی تک کانگرس کے ساتھ تھا۔

مسلمانوں کی آنکھ اُس وقت کھلی جب حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس جسے آزادی کہتی تھی، وہ ہندو اکثریت کی حکومت کا دوسرا نام تھا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات نے پہلی بار کانگرس کی حکومت ہندوستان کے سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا، اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے جلد بازی پر اُتر آئے ـــــ واردھائی مہاتما کا زہر میں بجھا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آچکا تھا ـــــ رام راج کی برکات واردھا یا ودیا مندر جیسی ناپاک اسکیموں کی صورت میں نازل ہونے لگیں۔ ربِ کعبہ کے سامنے سربسجود ہونے والی قوم کے بچوں کو مدارس میں گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جاتا۔ محمدؐ عربی کی نعت پڑھنے والوں کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جا رہا تھا ـــــ دخترانِ توحید کے نصابِ تعلیم میں دیوداسیوں کے رقص شامل کیے جا رہے تھے ـــــ مسلمانوں کے حلق میں یہ زہر اُنڈیلنے کے لیے ان تجاویز کے بانیوں نے وہ ہاتھ منتخب کیے جن کی انگلیوں پر ابھی تک قرآن حکیم کی تفسیریں لکھنے والے قلم کی سیاہی کے نشان

www.allurdu.com

موجود تھے۔

رام راج کی بقا کے لیے مسلمانوں کے تمدّن کے علاوہ ان کی زبان بدلنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ چنانچہ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی جدّوجہد زیادہ شدّ و مد کے ساتھ شروع ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے مکمّل اِستیصال کے لیے گاندھی جس موقع کا منتظر تھا، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا لیکن ہندو عوام جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے کے لیے یہاں تک گوارا کر لیا تھا کہ اچھوت انکے چند مندروں کو بھرشٹ کر ڈالیں، کینہ اور نفرت کے ان جذبات کو دیر تک چھپا کر نہ رکھ سکے، جن کی اساس پر ہندو نیشنلزم کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ چنانچہ وسطِ ہند کے صوبوں میں لُوٹ مار اور قتل کی وارداتیں شروع ہُوئیں، جس شہر یا گاؤں میں ہندو مسلمانوں پر حملہ کرتے، وہاں کانگرسی حکومت کی پولیس ثالث بن کر پہنچتی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے ذلیل ترین شرائط ماننے پر مجبور کیا جاتا۔

مسلم لیگ کی طرف سے مصالحت اور تعاون کی پیش کش ٹھکرائی جا چکی تھی۔ جواہر لال نہرو کے یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے "ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں۔ ایک انگریز، دوسری کانگرس"

رام راج کا یہ دور اگرچہ مختصر تھا تاہم سنجیدہ مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ اگر انھوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو اندلس کی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلمانوں کے مدافعانہ شعور کی عملی صورت پاکستان کی قرارداد کی شکل میں ظاہر ہُوئی۔

پاکستان کا مطالبہ سراسر مدافعانہ تھا۔ مسلمان، ہندو فسطائیت کے اُٹھتے

ہوئے سیلاب کے سامنے ایک دفاعی خط کھینچنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خود مختاری کا حق دے کر اپنی اکثریت کے صُوبوں میں آزادی اور خود مختاری کا حق مانگا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے تین چوتھائی حصّے پر ہندو اکثریت کا حق تسلیم کر لیا اور اپنے لیے جو علاقہ مانگا تھا وہ ان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے بھی کم تھا لیکن ہندو ایک مرکز کے ماتحت درۂ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک اپنی اکثریت کے دائمی تسلّط کے خواب دیکھ چکا تھا۔ واردھا کے صنم خانوں میں وہ اسکیمیں تیار ہو چکی تھیں جن کی بدولت چند سال میں مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور روحانی اعتبار سے یتیم بنایا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان پر متحد ہوتا دیکھ کر بھارت کے بنیوں نے یہ محسوس کیا کہ شکار ہاتھ سے جا رہا ہے۔ مرغِ حرم نے متحدہ قومیّت کے اُس دامِ فریب کو پہچان لیا ہے، جسے بظاہر بے ضرر بنانے کے لیے عدمِ تشدّد کی بھٹی سے رنگ دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تلملا کر رہ گئے۔ جال بچھانے والے شکاری جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ منتشر پرندے بے تحاشا اُن کی شکارگاہ کا رُخ کر رہے ہیں۔ انھیں کسی اور طرف مائل پرواز دیکھ کر اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آتے۔ اضطراری حالت میں انھوں نے اپنے چہروں سے وہ نقاب اتار کر پھینک دیے جو مسلمانوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ مسلمان یہ دیکھ رہا تھا کہ آزاد خیال ہندو، تنگ نظر ہندو، دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے ہندو، دیوتاؤں سے بیزاری ظاہر کرنے والے ہندو، اچھوت کو گلے لگانے والے ہندو اور اچھوت کو سب سے زیادہ قابلِ نفرت مخلوق سمجھنے والے ہندو، انگریز کی خوشامد اور چاپلوسی سے اقتصادی مراعات حاصل کرنے والے ہندو اور فقط بکری کے دودھ اور پھلوں کے رس پر قناعت کر کے انگریز کو

www.allurdu.com

مرن برت کی دھمکیاں دینے والے ہندو سب ایک تھے۔ کفر اپنے ترکش کے ہر تیر کو جمع کر چکا تھا لیکن مسلمان ابھی تک بکھرے ہوئے تیروں اور ٹوٹی ہوئی کمانوں کو گن رہے تھے۔

اگر مسلمان پاکستان کا مطالبہ دس[1] سال پہلے کرتے تو عدم تشدّد کے دیوتا اور اُس کے پُجاری اس وقت بھی اپنے اصلی رُوپ میں ظاہر ہو جاتے اور مسلمانوں کو اپنی مدافعانہ تیاریوں کا موقع مل جاتا لیکن انھیں اس وقت اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کی چھت اور دیواروں کی مرمّت کی فکر ہوئی جب اُفق پر چاروں طرف تاریک گھٹائیں اُٹھ رہی تھیں۔ ہندو جس یقینِ محکم کے ساتھ اپنے جارحانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ رہا تھا، وہ مسلمانوں میں مفقود تھا۔ نیم خوابی کی حالت میں واردھائی مکر و فریب کے پھندے دیکھنے کے بعد مسلمان اُونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے پاکستان کی منزلِ مقصود کا رُخ کر رہے تھے۔

ہندو نے جہاں گزشتہ پندرہ بیس برس میں اپنی قوم کو متحد اور منظم کر لیا تھا، وہاں مسلمانوں کے اندر انتشار کے کئی بیج بو دیے تھے۔ وہ اس

---

[1] ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؒ دس سال قبل پاکستان کو مسلمانوں کی منزلِ مقصود قرار دے چکے تھے لیکن اس وقت اسے شاعر کا ایک خواب سمجھا گیا تھا۔ چودھری رحمت علی غالباً تحریکِ پاکستان کے اوّلین محرکوں میں سے ایک ہیں۔ جو پاکستان کو اپنا مقصدِ حیات بنا چکے تھے لیکن وہ فقط ایک محدود طبقے کو متاثر کر سکے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور سیاسی شعور کے فقدان کے علاوہ یہ بھی تھی کہ ہندو فسطائیت ابھی تک مکر و فریب کے کئی چولوں میں چھپی ہوئی تھی۔

بات کے لیے تیار تھا کہ اگر متحدہ قومیت، عدم تشدّد اور وطنیت کی لوریاں مسلمانوں کو موت کی نیند نہ سُلا سکیں اور وہ اپنی شاہ رگ کے قریب اُس کا زہر آلود خنجر دیکھ کر چونک پڑیں تو ان کے حلق میں خواب آور گولیاں ٹھونسنے کے لیے اُن بزرگانِ دین کے ہاتھ استعمال کیے جائیں جن کا جُبّہ اور دستار یہ ظاہر کرتا ہو کہ جنت کی راہ دکھانے والے یہی ہیں۔ چنانچہ کانگرس ان ملّت فروش کی ایک جماعت تیار کر چکی تھی، جو ایک ہاتھ سے مسلمانوں کو قرآن دکھاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اُن کے گلے میں ہندو کی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔

تجربہ کار شکاری جب یہ دیکھتے ہیں کہ پرندے ان کے جال کو پہچاننے لگے ہیں تو وہ سدھائے ہوئے ہم جنس پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے جال کے آس پاس جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔ ان سدھائے ہوئے پرندوں کی بولی سے آس پاس بھٹکنے والے پرندے دھوکا کھا کر جال میں آپھنستے ہیں۔ اس طریقہ سے عام طور پر تیتر اور بٹیر کا شکار کیا جاتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کو بلا خطر جال کی طرف آنے کی ترغیب دینے والے تیتروں یا بٹیروں کو شکاریوں کی اصطلاح میں "بلاوے"[1] کے تیتر یا بٹیر کہا جاتا ہے۔

تلیروں کے شکار میں یہ طریق کار بدلنا پڑتا ہے۔ اسیر تلیر شکاریوں کی ہزار نازبرداری کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جال کی طرف رُخ کرنے کا بلاوا نہیں

---

[1] پنجابی میں "بلارا" بھی کہتے ہیں۔

www.allurdu.com

دیتا۔ اس لیے اُسے دھوکا دینے کے لیے ممولے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ممولا گھریلو چڑیا سے قدرے بڑا ہوتا ہے اور تلیر اُسے اپنا پیدائشی دشمن خیال کرتا ہے، شکاری ممولے کو پکڑ کر پھندے کے قریب باندھ دیتے ہیں اور تلیروں کا غول اسے دیکھتے ہی پھندے یا جال سے بے پرواہ ہو کر اُس پر حملہ کر دیتا ہے۔

واردھا کے کہنہ مشق شکاری نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان ہندو سامراج کے دام فریب سے خطرہ محسوس کر کے پاکستان کی منزل کا رُخ کر رہے ہیں تو اس نے نام نہاد علمائے دین کے اس گمراہ ٹولے کو آگے کیا جو خدا پرستی سے توبہ کر کے وطن کا پجاری بن چکا تھا، جو محمد عربی ﷺ کے دامن کا سہارا چھوڑ کر لنگوٹی والے مہاتما سے رشتہ جوڑ چکا تھا۔ ان لوگوں کو وہی کام سونپا گیا جو شکاری بلاوے کے تیتروں اور بٹیروں سے لیتے ہیں۔ یہ علماء ہندو سامراج کا جال بچھانے والے شکاریوں کی سکھائی ہوئی بولیاں بول رہے تھے "مسلمانو! آؤ۔ یہ تمھاری آزادی کی منزل ہے۔ دیکھو ہم آزاد ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ تمھیں یہاں پھنسانے کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو یہاں اناج بھی ہے اور پانی بھی۔ پاکستان بھوکا ہے۔ تمھیں وہاں یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔ ہمیں دیکھو! ہمیں پہچانو! ہم تمھارے لیڈر ہیں۔ ارے! تم یہ سمجھتے ہو کہ ہندو تمھیں کھا جائے گا؟ یہ ہندو جس پر تم نے برسوں حکومت کی ہے! کیا یہ بزدلی نہیں کہ تم ہندو سے تحفّظات مانگتے ہو؟ خدا کی قسم جب ہندو سے اپنے حقوق لینے کا وقت آئے گا تو ہم اس کے کان پکڑ کر اپنے مطالبات منوائیں گے۔ اگر ہندو کی نیت خراب ہوتی تو ہم اس کے ساتھ کیوں ہوتے؟ وہ لوگ تمھارے خیر خواہ نہیں جنھوں نے تمھیں مہاتما گاندھی جیسے بے ضرر انسان سے بدظن کیا ہے۔ مہاتما جی نے تمھارے لیے قیدیں کاٹیں۔ بکری کا دودھ پیا۔ چرخہ چلایا اور مرن برت

رکھے۔ تمھارے یہ لیڈر جو تمھیں مہاتما گاندھی سے بدظن کرتے ہیں، وطن کی آزادی کے دشمن ہیں۔ اسلام کے دشمن ہیں۔ خدا کے دشمن ہیں۔ ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ پاکستان کا خیال ترک کر دو۔ آؤ! یہاں آؤ! یہاں دانے اور پانی کی فراوانی ہے، یہاں کوئی خطرہ نہیں آئے گا۔ آؤ! ہمارے ساتھ مل کر نعرہ لگاؤ۔ "انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!!"

ایک طرف یہ "بلاوے" کے پرندے ہندو سامراج کی حمایت کے لیے نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت تیار کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندو پریس ممولے کی مدد سے تلیروں کے پھانسنے کے طریق کار پر عمل کر رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان سے قبل جب بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان تحفّظات کے لیے مصر ہو رہے ہیں، تو انگریز کے خلاف چند نعرے لگا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح تلیر ممولے کو دیکھ کر شکاری اور اس کے پھندے سے بے پروا ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہندو کے متعلق مسلمان کے شکوک اور شبہات انگریز دشمنی کے جذبات میں دب کر رہ جاتے۔ حرّیت پسند مسلمان ہندوؤں کا ساتھ دے کر جیلوں میں چلے جاتے، پھر گاندھی جی مرن برت رکھ کر یا کسی اور بہانے سے جیل سے باہر آ جاتے اور حکومت کے ساتھ مصالحانہ باتوں کا دور شروع ہوتا۔ ہندو کچھ مراعات حاصل کر لیتے یا مراعات حاصل کرنے میں ناکام رہتے۔ بہر حال مسلمانوں کی مدافعانہ تحریک قصّۂ ماضی بن کر رہ جاتی۔

مسلمانوں کو پاکستان کے محاذ سے بہکانے کے لیے کانگرس نے اُن کے سامنے آخری بار انگریز کا ممولا رکھا۔ چنانچہ ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے یہ نعرے بلند ہونے لگے "مسلم لیگ انگریز کی آلۂ کار ہے۔ قائدِ اعظم اگر پاکستان کے مطالبہ پر بضد رہا تو انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر جنگ

www.allurdu.com

کے بعد بھی اس ملک میں اپنے پاؤں جمائے رکھے گا۔ پاکستان مسلمانوں کا مطالبہ نہیں بلکہ انگریز کی شرارت ہے، لہٰذا یہ وطن سے غداری کے مترادف ہے اور اسلام کی تعلیمات کے صریحًا خلاف۔ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ انگریز نے پیدا کیا ہے۔ انگریز ہمارا اصلی دشمن ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی کانگرس مختلف طریقوں سے حکومت پر زور دے رہی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف فورًا کوئی اعلان کرے ورنہ کانگرس اس کی جنگی سرگرمیوں میں رخنہ انداز ہونے سے دریغ نہیں کرے گی۔ انگریز ہر قیمت پر ہندو کی ناز برداری کے لیے تیار تھا لیکن وہ مجبور تھا۔

اٹلی، جرمنی اور جاپان کے خلاف لاکھوں مسلمان سپاہی انگریز کے دوش بدوش لڑ رہے تھے اور انگریز ہندو مہاسبھاؤں کے تعاون کی اُمید پر پاکستان کی مخالفت سے ان لوگوں کے احساسات مجروح کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ کانگرس کبھی چاپلوسی اور کبھی دھمکیوں سے کام لے رہی تھی۔ اُسے اس بات پر اصرار نہ تھا کہ انگریز اس ملک کو فورًا خالی کر دیں، وہ صرف یہ وعدہ لینا چاہتی تھی کہ وہ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت اقلیتوں کو نظر انداز کریں گے۔

۱۹۴۲ء میں یورپ میں ہٹلر کا طوطی بول رہا تھا۔ یورپ کی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جرمن افواج روس پر یورش کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سیل ہمہ گیر کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ جرمنی کی آبدوزیں امریکہ کے ساحلوں کا طواف کر رہی تھیں، لنڈن پر بمباری ہو رہی تھی، کبھی کبھی گاندھی جی کی آتما کو ان باتوں سے دُکھ پہنچتا اور وہ فریقین کو عدم تشدّد کا سبق دیتے لیکن جب جاپان میدانِ جنگ میں کود پڑا

تو عدم تشدّد کے دیوتا نے انگریز کی شکست کے متعلق پُر امید ہو کر ہندو سامراج کے احیاء کی تمام توقعات جاپانیوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ چنانچہ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہوئی۔ کانگرس کے مہاتما نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ کامل آزادی سے میرا مطلب یہ ہے کہ بیرونی حکومت انگریز کی ہو اور اندرونی تسلّط ہمارا ہو —— اب کامل آزادی کے لیے انگریز کی بجائے جاپان کے بیرونی تسلّط کے لیے راہ صاف کی جا رہی تھی —— ہندو کو یقین تھا کہ وہ اس نازک موقعے پر اپنے آپ کو انگریز کا دشمن ظاہر کر کے اس ملک کے نئے فاتحین یعنی جاپانیوں کی نگاہ میں انعامات کا مستحق سمجھا جائے گا۔ کم از کم جاپانی مسلم اقلیّت کے حقوق کے متعلق اُس کے نقطۂ نظر کی حمایت ضرور کریں گے۔ لیکن یہ شاید مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جاپانیوں کا سیلاب برما سے آگے نہ بڑھ سکا اور عدم تشدّد کے دیوتا کے پجاری چند پُل توڑنے، ٹیلیفون کے تار کاٹنے، پوسٹ آفس جلانے، چند بابوؤں کو دھول دھپّا کرنے، چند چپراسیوں کی وردیاں پھاڑنے اور بعض سرکاری عمارتوں سے انگریز کا جھنڈا اتار کر اس کی جگہ کانگرس کا جھنڈا لہرانے کے بعد خاموش ہو گئے۔ مشرق کا وہ نیا دیوتا جو کانگرسی دیش بھگتوں کے خیال کے مطابق بھارت ماتا کی عظمتِ رفتہ کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے آ رہا تھا، منی پور سے آگے نہ بڑھ سکا۔

———— ✳ ————

سلیم ایک ادیب کی حیثیت میں اپنے ہوسٹل کے لڑکوں کا ہیرو بن چکا تھا۔ اُس کی شاعری میں برسات کی ندیوں کی روانی، پرندوں کی موسیقی اور بہار کے پھولوں کی رعنائی تھی۔ اس کے افسانے اور مضامین دیہاتی زندگی

www.allurdu.com

کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کے آئینہ دار تھے لیکن اختر جس نے شروع شروع میں اس کی حوصلہ افزائی کی تھی، اب اُس کے ادبی رجحانات بدلنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ "سلیم!" وہ کہتا۔ "تم بہت اچھا کہتے ہو، تم خوب لکھتے ہو لیکن یہ بے مقصد ادب اس قوم کے لیے مفید نہیں جس کے گرد چاروں طرف سے آلام و مصائب کی آندھیاں گھیرا ڈال رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تمھارے گاؤں کی قمریوں کے ترانے دل کش ہیں، تمھارے باغ کے پھولوں کی مہک خوش گوار ہے اور تمھارے افسانوں کے دیہاتی کردار بے حد دلچسپ ہیں لیکن تم اس طوفان کو نظر انداز کر رہے ہو جو کسی دن ان دلفریب مسکراہٹوں کو آنسوؤں میں تبدیل کر دے گا۔ اس آگ سے آنکھیں بند کر رہے ہو جو تمھارے خرمن کو راکھ کا انبار بنانے والی ہے۔ بے شک تمھارے گاؤں کی محفلیں دلچسپ ہیں لیکن اُس قوم کے متعلق سوچو، جو ہزاروں برس پہلے اس ملک میں آزادی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس قوم کے شاعر تمھاری طرح برسات کی ندیوں کے نغمے سنتے ہوں گے، موسمِ بہار کے پھولوں سے باتیں کرتے ہوں گے، اور پھر تمھارے گاؤں کے لوگوں کی طرح وہ اپنی اپنی بستیوں میں محفلیں منعقد کرتے ہوں گے۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوں گے، جو تمھارے گاؤں میں ہوتی ہیں لیکن بھیڑیا خصلت انسانوں کا ایک گروہ آیا۔ اُس نے یہ بستیاں ان سے چھین لیں اور یہ محفلیں درہم برہم کر ڈالیں۔ جانتے ہو یہ لوگ کون ہیں؟"

اور پھر وہ خود ہی جواب دیتا۔ "یہ ہندوستان کے سات کروڑ اچھوت ہیں جو آرین حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور مغلوب ہونے کے بعد اس ملک کے سیاسی، روحانی اور اقتصادی یتیم بن کر رہ گئے ـــــ سلیم! تم

کہوگے کہ وہ احمق تھے جو دشمن کے مقابلے میں سردھڑ کی بازی نہ لگا سکے لیکن ان کے شاعروں اور مفکّروں کو کیا کہو گے جو انھیں بروقت جگا نہ سکے، جو اس وقت بھی جب دشمن سر پر کھڑا تھا، الاؤ کے گرد یا درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر انھیں میٹھے راگ اور دلچسپ کہانیاں سناتے رہے؟ میرے دوست! نفرت اور حقارت کا وہ طوفان جس نے برہمن کی تقدیس کا لبادہ اوڑھ کر اچھوتوں کو تباہ و برباد کیا تھا، آج صدیوں کے بعد پھر اٹھ رہا ہے اور اس مرتبہ اُس کا رُخ ہماری طرف ہے۔ ہندو سماج کا احیا ہندو نیشنلزم کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اگر ہم اس طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے تو ہمارا حال اچھوتوں سے بھی بُرا ہوگا۔ اچھوتوں کو ہندو سوسائٹی کا قابلِ نفرت حصّہ بن کر زندہ رہنے کی اجازت مل گئی لیکن ہمارے لیے دو ہی راستے ہوں گے: موت یا ترکِ وطن۔"

"سلیم!" اختر کے لہجے میں سختی آجاتی۔ "اگر تم اجتماعی زندگی کا شعور نہیں رکھتے تو کم از کم اس گاؤں کے لیے جس کی حسین فضاؤں میں تم نے نغمے اور قہقہے سیکھے ہیں، آنے والے خطرات کا احساس کرو۔ جب طوفان دوسری ہزاروں بستیوں کو تباہ و ویران کر دے گا۔ تو تمھارا گاؤں اس لیے نہیں بچ رہے گا کہ وہاں تم جیسے شاعر نے پرورش پائی ہے۔ بربریت کے ہاتھ جب ہزاروں محفلیں ویران کریں گے تو تم انھیں یہ کہہ کر نہیں روک سکو گے کہ اس محفل کی طرف مت بڑھو یہاں میں نے مسکرانا اور ہنسنا سیکھا ہے۔ اس وقت تمھیں یہ سمجھ آئے گی کہ اجتماعی آلام و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اجتماعی جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت تم کہو گے کہ کاش میں قوم کو میٹھے اور سہانے نغمے سنانے کی بجائے جھنجھوڑ کر جگاتا۔"

پھر سلیم کا چہرہ دیکھ کر اختر کے لہجے میں ملائمت آجاتی۔ "سلیم! میری

باتیں ذرا تلخ ہیں لیکن میں حقیقت کے چہرے پر حسین پردے نہیں ڈال سکتا۔ قدرت نے جو صلاحیتیں تمھیں دی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان کا استعمال غلط نہ ہو۔ تمھاری تحریر میں جادو ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ جادو قوم کو سلانے کی بجائے جگانے کے کام آئے۔ موجودہ حالت میں صرف پاکستان ہی ہماری بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ چٹان ہے جس پر کھڑے ہو کر ہم ہندو فاشزم کے سیلاب کا منہ پھیر سکیں گے۔ شاعروں اور ادیبوں نے کئی اقوام کو موت کی نیند سلانے کے لیے لوریاں دی ہیں لیکن ایسے شاعر بھی تھے، جن کے الفاظ نے شکست کھا کر پیچھے ہٹنے والی فوج میں نئی روح پھونک دی۔ قرونِ اولیٰ میں ہمیں ایسے شعرا کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو روم و ایران میں اسلام کی عظمت کے پرچم لہرانے والے مجاہدین کے دوش بدوش جہاد کیا کرتے تھے ـــــ آج کا شاعر اگر پاکستان کی اہمیت محسوس نہیں کرتا تو میں کہوں گا کہ وہ اپنے ماحول سے بیگانہ ہے۔"

اختر کے ساتھ ایسی ملاقاتوں کے بعد سلیم اپنے دل میں نئے ارادے اور نئے ولولے لے کر اٹھتا۔ اسے اپنے گاؤں کی محفلیں عزیز تھیں۔ اپنے کھیتوں اور باغوں کے پھول پیارے تھے۔ اسے اُن سیدھے سادھے لوگوں کے قہقہوں اور مسکراہٹوں سے اُنس تھا جو وقت کو منٹوں اور سیکنڈوں کے پیمانے کی بجائے دنوں مہینوں اور برسوں کے پیمانے سے ناپا کرتے تھے۔ پھر اُسے جگر دوز چیخیں سنائی دیتیں، اپنے گاؤں کی عورتوں اور بچّوں کی چیخیں۔ وہ کپکپا اٹھتا ـــــ وہ اس دیو کو روکنے کے لیے پاکستان کی چار دیواری کی ضرورت محسوس کرتا۔ وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا اور پاکستان کے متعلق کوئی مضمون شروع کر دیتا۔ وہ ظالم ہیں، وہ سامراجی ہیں، وہ فسطائی ہیں، وہ

ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو آریہ فاتحین نے ہندوستان کی مفتوح اقوام کے ساتھ کیا تھا ـــــ لیکن کیوں؟" وہ سوچتا۔ "کیا وہ انسان نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا سلوک کیونکر کر سکتا ہے ـــــ؟"

پھر وہ خود ہی جواب دیتا۔ "کیا ہندوستان کے قدیم باشندے انسان نہ تھے اور برہمن نے انسان ہوتے ہوئے ـــــ؟ لیکن وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب دنیا میں علم کی روشنی پھیل چکی ہے۔" سلیم اپنے دل کو تسلّی دیتا۔ حقیقت کا بھیانک چہرہ تھوڑی دیر کے لیے تصوّرات کے خوشگوار دھندلکے میں چھپ جاتا اور اس دھندلکے میں اڑتا ہوا وہ اپنے گاؤں میں پہنچ جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچّے اُسے دیکھتے ہی شور مچاتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے۔ مسلمانوں کے بچّے، سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچّے، وہ سب سے پیار کرتا تھا ـــــ وہ اس سے لپٹ جاتے ـــــ کوئی اس کے کندھے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ کوئی اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونس دیتا۔ مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کی شلوار یا پتلون کا ستیاناس کر دیتے۔ وہ انھیں کھانڈ کی ٹکیاں یا کوئی اور کھانے کی چیز تقسیم کرتا۔ بچے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر اپنا ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے "بھائی جان مجھے دو۔ مجھے دو!" سلیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ یہ روشنی کا زمانہ ہے۔ وہ مطمئن سا ہو کر قلم رکھ دیتا لیکن اچانک وہ دل کی ایک اور آواز سنتا۔ "کیا اس روشنی کے زمانے میں ان دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی، جن کے سامنے کبھی اچھوتوں کا بلی دان دیا جاتا تھا ـــــ؟"

ـــــ * ـــــ

www.allurdu.com

کالج کی علمی اور ادبی مجالس کی طرح ہوسٹل کی بزمِ ادب بھی کبھی کبھی جلسے کیا کرتی تھی۔ ان جلسوں میں عام طور پر ٹھوس علمی و ادبی مباحثوں کی نسبت ہنسنے اور ہنسانے کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرہ ہوتا تو سن کر داد دینے والوں کی نسبت سنے اور سمجھے بغیر شور مچانے والوں کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی اور گھبرائے ہوئے اور سہمے ہوئے نوجوان شعراء کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ انھیں داد مل رہی ہے یا گالیاں!

کسی موضوع پر مباحثہ ہوتا تو ہوسٹل کے زندہ دلوں کا ایک گروہ پہلے ہی فیصلہ کر کے آتا کہ آج کس کے لیے تالیاں بجانی ہیں اور کس کی بات پر قہقہے لگانے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکے اختر کو بھی ان جلسوں میں کھینچ لاتے۔ اختر اب پاکستان کا مبلغ بن چکا تھا لیکن اس کے ایک اور ہم جماعت الطاف کو پاکستان کے نام سے چڑ تھی۔ وہ گاندھی کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان اور اُس کے اُن مسلمان چیلوں کو اپنا روحانی اور سیاسی پیشوا سمجھتا تھا جو رام راج کی ضروریات کے مطابق آیاتِ ربّانی کی تفسیریں کیا کرتے تھے۔ کالج میں بھی وہ طالب علموں کے اس گروہ کا لیڈر تھا جو نیشنلسٹ کہلانے کے لیے کبھی کبھی کھدّر پہن لیا کرتے تھے ——— اختر تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو الطاف اُٹھ کر احتجاج کرتا۔ ”صاحبِ صدر! پاکستان ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اختر کی تقریروں سے وطن پرست مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اس لیے اس موضوع پر بولنے کی اجازت نہ دی جائے!“

الطاف کے ساتھی یکے بعد دیگرے اس کی تائید میں کھڑے ہو جاتے۔ اس کے جواب میں اختر کے حامی اُٹھتے۔ ”ہم اختر کی تقریر ضرور سنیں گے۔“ جب

دونوں طرف کا جوش و خروش انتہا کو پہنچ جاتا تو آفتاب، چھ فٹ کا ایک قوی ہیکل پٹھان اٹھ کر صاحبِ صدر کی میز کے قریب آ جاتا اور ایک فیصلہ کن انداز میں کہتا: ”الطاف! اگر تم اختر کی تقریر نہیں سن سکتے تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ ہم خود نکال دے گا۔ تم خواہ مخواہ ہر جلسے کو خراب کرتے ہو۔“

سلیم اپنے دونوں ہاتھ الطاف کے کندھوں پر رکھ دیتا: ”الطاف صاحب! تشریف رکھیے نا!!“

یہ الفاظ جس قدر نرم ہوتے اُسی قدر الطاف کے کندھوں پر ان کا دباؤ ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا۔ ”الطاف صاحب!“ سلیم کے ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہو جاتی۔ کالج کا ایک اور طالب علم منصور بھی کبڈی کا مشہور کھلاڑی تھا۔ اُس کی کلائیاں الطاف کی پنڈلیوں کے برابر تھیں۔ وہ سلیم کا اشارہ پا کر آگے بڑھتا اور مسکراتا ہوا اپنا ایک ہاتھ الطاف کے کندھے پر رکھ دیتا اور اپنے مخصوص انداز میں کہتا۔ ”ارے یار! کیوں سر کھپا رہے ہو۔ بیٹھ بھی جاؤ!“

الطاف بیٹھ جاتا۔ شور اور ہنگامے میں بہت کم لڑکوں کو اس بات کا احساس ہوتا کہ وہ بیٹھا نہیں، بٹھایا گیا ہے۔

سلیم اب دوسرے لڑکوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہتا۔ ”بھئی بیٹھ جاؤ۔ الطاف صاحب نے اپنا اعتراض واپس لے لیا ہے۔“

الطاف اچانک اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن منصور اور سلیم کے ہاتھوں کے شکنجے میں بے بس ہو کر رہ جاتا۔

مجلس میں سکون کے آثار دیکھ کر آفتاب کہتا۔ ”دیکھو الطاف! خدا کی قسم اگر اب تم نے تقریر ختم ہونے سے پہلے کوئی شرارت کی تو ہم بہت بُرا سلوک

www.allurdu.com

کرے گا۔ اگر تمھیں کچھ کہنا ہے تو اختر کی تقریر کے بعد اسٹیج پر آجاؤ!"

صدر عام طور پر ہوسٹل ہی کی کوئی مرنجاں مرنج شخصیت ہوتی۔ وہ اکثریت کے فیصلے کا احترام کرتا اور اکثریت کا فیصلہ عام طور پر یہی ہوتا کہ اختر کی تقریر سُنی جائے۔

بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سلیم نے اختر کی تقلید کی، اور ایم اے میں داخل ہوگیا۔ کالج اور ہوسٹل میں اختر پاکستان کا ایک اَن تھک مبلغ تھا۔ اور اب تک کئی نوجوان اُس کے ہم خیال ہوچکے تھے۔ پاکستان کے متعلق ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے جو معاندانہ پروپیگنڈہ ہو رہا تھا، اس نے مسلم عوام کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔

ہوسٹل کی بزم ادب کے زیر اہتمام ایک مباحثہ ہو رہا تھا جس میں بحث کا موضوع یہ تھا کہ "کیا پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات کا صحیح حل پیش کرتا ہے" اس جلسے میں ہوسٹل کے طلبا کے علاوہ کالج کے دوسرے طلبا کو بھی حصّہ لینے کی دعوت دی گئی۔

مباحثے کی تاریخ سے دو دن پہلے اختر کو کھانسی اور زکام کے ساتھ بخار کی شکایت ہوگئی۔ پہلے دن اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ دوسرے دن بخار زیادہ شدید ہوگیا اور سلیم ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے نمونیا ہے۔

سلیم اسے ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق دوائی پلاتا رہا۔ رات کے وقت سلیم کے ساتھ آفتاب اور منصور بھی اُس کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ دو بجے

کے قریب اختر کی آنکھ لگ گئی۔ آفتاب اور منصور اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن سلیم وہیں بیٹھا رہا۔

تنہائی سے اکتا کر اس نے اختر کی میز سے ایک کتاب اُٹھائی لیکن چند سطریں پڑھنے کے بعد اُس نے کتاب پھر میز پر رکھ دی اور دوسری کتاب اٹھالی، اس میں بھی وہ دلچسپی نہ لے سکا۔ اس کے بعد اُن کاغذوں کی باری آئی جو اختر کی میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کاغذ کے پرزے پر چند فقرے لکھے ہوئے تھے۔ سلیم نے کاغذ کا یہ پرزہ اٹھالیا اور بے توجہی سے ایک نظر دیکھنے کے بعد وہیں رکھ دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُسے کوئی خیال آیا اور اس نے پھر یہ کاغذ کا پرزہ اٹھالیا۔ وہ فقرے جو اسے پہلی نظر میں بے ربط سے نظر آئے، اب بہت اہم محسوس ہوتے تھے —— یہ اختر کی تقریر کے نکات تھے۔

سلیم نے چند بار یہ سُرخیاں پڑھیں اور پھر کاغذ کا پرزہ میز پر رکھ کر اختر کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اختر کل بحث میں شریک نہیں ہوسکے گا۔ الطاف اور اس کے ساتھی سخت تیاری کے بعد مباحثے میں حصّہ لینے کے لیے آرہے ہیں۔ اختر کی غیر حاضری میں شاید پاکستان کے حق میں بولنے والوں میں سے کوئی ان کے دانت کھٹے نہ کرسکے۔ اگر انھوں نے میدان مار لیا تو اختر کو یقیناً اس بات کا صدمہ ہوگا۔ پاکستان اختر کے لیے محض ایک نظریاتی مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ یہ وہ مرکز تھا جس کے گرد اُس کے خیالات پرواز کیا کرتے تھے۔ وہ ساحل تھا جہاں پہنچنے کے لیے وہ بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا —— یہ وہ نعرہ تھا جس میں اُس کی

www.allurdu.com

زندگی کے تمام نغمے گم ہو چکے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کے لیے میں اپنے دل میں دس کروڑ مسلمانوں کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہوں۔ ایک دن میری آواز دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہو گی اگرچہ ہماری راہ میں کانٹوں کی باڑیں کھڑی کی جائیں گی لیکن ہم انھیں روندتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ایک دن اس نے کہا تھا "سلیم! تم میں ابھی تک اجتماعی زندگی کا شعور پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک تم یہ سمجھتے ہو کہ وقت کا بہترین مصرف اس قسم کے افسانے لکھنا اور شعر کہنا ہے لیکن وہ دن دُور نہیں جب تم یہ محسوس کرو گے کہ اُن چند لمحات کے سوا جن میں تم نے پاکستان کے لیے کوئی عملی کام کیا ہے، تمھاری باقی زندگی بے حقیقت تھی۔ آج تم کسی فرضی محبوب کے کوچے کی خاک کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہو لیکن وہ دن دور نہیں جب تمھیں پاکستان کی ایک ایک انچ زمین کو دشمن سے بچانے کے لیے زندگی کی عزیز ترین خواہشات کو قربان کرنا پڑے گا —— سلیم! میں تمھیں افق پر اُٹھنے والی آندھی کے آثار دکھا رہا ہوں اور تم اسے میرا وہم سمجھتے ہو لیکن جب یہ آندھی آئی تو تم محسوس کرو گے کہ پاکستان کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں۔ میں بارش سے پہلے مکان پر چھت ڈالنا چاہتا ہوں اور تم بارش میں کھڑے ہو کر چھت ڈالنے کی فکر کرو گے۔ میرے دوست! پاکستان کی جنگ ایک اجتماعی فریضہ ہے اور اگر تم اپنی موت و حیات دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات سے وابستہ کر چکے ہو تو اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ سلیم! آؤ! میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلو تاکہ اگر کہیں میرے پاؤں لڑکھڑا جائیں تو میں تمھارے مضبوط بازوؤں کا سہارا لے سکوں۔ کم از کم مجھے یہ تسلّی ضرور ہو گی کہ میں تنہا نہیں لیکن کل تمھیں زخمیوں اور اپاہجوں کو اٹھا کر پاکستان کی منزل کا رُخ کرنا پڑے گا۔"

"اختر تم تنہا نہیں ہو، میں تمھارے ساتھ ہوں!" سلیم اپنے دل میں نئے ولولے اور نئی امنگیں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے میز سے قلم اٹھایا اور کورے کاغذ پر لکھنے میں مصروف ہو گیا —— اُس نے رک رک کر چند ابتدائی سطور لکھیں لیکن اس کے بعد وہ اپنے قلم میں بلا کی روانی محسوس کر رہا تھا۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو صبح کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز کے بعد وہ اپنے مضمون پر نظرِ ثانی کرنے کیلیے کرسی پر آ بیٹھا۔ رات کی بے آرامی کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر سستانے کی نیّت سے اس نے میز پر اپنی کہنیاں ٹیک دیں اور کلائیوں پر سر رکھ دیا۔ چند منٹ بعد اسے نیند آ گئی۔

آفتاب کمرے میں داخل ہوا تو اختر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بستر پر بیٹھا سلیم کا مضمون پڑھ رہا تھا۔ "بھئی اختر! اپنی جان پر اتنا ظلم نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے آفتاب نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیے اور پھر اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "بھئی تمھارا بخار ابھی اترا نہیں، ذرا کم ہوا ہے۔ خدا کے لیے آج مباحثے میں حصّہ لینے کا خیال چھوڑ دو۔ ہم تمھاری جگہ کسی اور کو بھرتی کر لیں گے۔"

اختر نے اطمینان سے کہا۔ "آفتاب! یہ پڑھو تو سہی!"

"بھئی میں پڑھے بغیر بھی تمھیں داد دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ایسی کیا مصیبت تھی کہ تم رات کے وقت اٹھ کر لکھنے کے لیے بیٹھ گئے —— اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ساری رات تمھاری رکھوالی کرتا۔"

"بھئی آہستہ بات کرو، سلیم سو رہا ہے۔"

"سلیم بھی کیسا نالائق ہے۔ جس نے تمھیں منع نہیں کیا۔"

"میں ابھی اٹھا ہوں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر کی دوا میں کیا تھا۔ میں نے تو کروٹ

www.allurdu.com

بھی نہیں بدلی۔ یہ سلیم کا کارنامہ ہے۔"

"لیکن یہ ہے کیا؟"

"بھئی یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔"

آفتاب اختر کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ چند سطور بے توجّہی سے دیکھنے کے بعد اس نے مضمون کو دوبارہ شروع سے پڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموشی سے پڑھنے کی بجائے اختر کو سُنا رہا تھا۔ الفاظ اور فقروں کی ترتیب، اس کی آواز میں زیر و بم پیدا کر رہی تھی۔

اس تحریر میں اُس پہاڑی ندی کی روانی اور موسیقی تھی جو کبھی سنگریزوں اور چٹانوں سے ٹکرا کر شور مچاتی ہے اور کبھی ہموار زمین میں پہنچ کر اچانک اپنی بلند تانیں گہرے اور میٹھے سروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر ایک اور ڈھلوان آجاتی ہے اور یہ سُر آہستہ آہستہ ابھرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ایک گہرے کھڈ کے سرے پر پہنچ کر یہ اُبھرتی ہوئی تانیں ایک آبشار کے ہنگاموں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سلیم کبھی پاکستان کے باغ کے متعلق ایک شاعر کا تصوّر پیش کر کے فرزندانِ قوم کو ان طوفانوں سے خبردار کر رہا تھا، جن کی آغوش میں ہزاروں تخریبی عناصر چھپے ہوئے تھے ـــــ اور کبھی دلائل کے پہاڑ پر کھڑا ہو کر پاکستان کے مخالفین پر مہیب چٹانوں کی بارش کر رہا تھا۔ آخری چند فقرے آفتاب نے کچھ ایسے جوش و خروش سے ادا کیے کہ سلیم گہری نیند سے جاگ اُٹھا۔ آفتاب اور اس سے زیادہ اختر کے چہرے پر اپنی تحریر کے اثرات دیکھ کر اس نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ مضمون ختم ہُوا اور وہ دونوں سلیم کی طرف دیکھنے لگے۔

آفتاب نے کہا "بھئی سلیم! میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم نے پہلی

بار اپنے قلم کا صحیح استعمال کیا ہے۔ اب وقت بہت تھوڑا ہے لیکن اگر تم یہ تقریر یاد کر لو تو بہت اچھا ہو گا۔ الطاف اختر کی بیماری پر بہت خوش ہے۔"

سلیم نے کہا "بھئی میں نے یہ تقریر مباحثے میں حصّہ لینے کی نیت سے نہیں لکھی تھی۔ میں نے ایک کاغذ کے پُرزے پر اختر کی تقریر کی سُرخیاں دیکھیں اور لکھنے بیٹھ گیا اور اب معلوم نہیں میں کیا لکھ چکا ہوں۔"

اختر نے کہا "سلیم! بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں بروقت اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا مشن کیا ہے۔ بعض آدمیوں میں قوم کے سپاہی بننے کی صلاحیّتیں ہوتی ہیں۔ قدرت انھیں قوم کی عزّت اور آزادی کا محافظ بنا کر بھیجتی ہے لیکن وہ شاعر، نقّال اور گویّے بن جاتے ہیں۔ بعض محض شاعر ہوتے ہیں اور وہ قوم کی بدقسمتی سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ بعض قدرت کی طرف سے بلند پایہ موجد کا دماغ لے کر آتے ہیں لیکن اپنی تن آسانی کے باعث داستان گو بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ میں غایت درجہ کی انفرادیت لے کر آتا ہے لیکن قوم کی اجتماعی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک شاعر ہے، ایک ادیب ہے۔ اس کا دل ایک رباب ہے جس کے نازک تاروں کے لیے کلیوں کی مسکراہٹ مضراب کا کام دیتی ہے۔ وہ ایک مصوّر ہے جس کے دل میں قدرت نے قوسِ قزح کے رنگ بھر دیے ہیں۔ وہ ایک مغنّی ہے جس نے آبشاروں اور پرندوں کے نغمے چُرائے ہیں لیکن قوم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، قوم کے بیٹے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت خطرے میں ہے۔ ایسے دور میں یہ لوگ اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی اجتماعی ضروریات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ شاعر پھولوں کی

www.allurdu.com

مسکراہٹ کی بجائے قوم کے معصوم بچوں کی جگر دوز چیخوں سے متاثر ہوتا ہے وہ قوم کو لوریاں نہیں دیتا بلکہ جھنجھوڑتا ہے۔ مصور قلم پھینک کر تلوار اٹھالیتا ہے اور مغنّی کے نغموں میں پرندوں کے چہچہوں کی بجائے تیغوں کی جھنکار اور توپوں کی دنادن سُنائی دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ قوم کے افراد میں اجتماعی شعور اور اجتماعی سیرت بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں، جو موجودہ حالات میں ہمارے لیے بے حد خطرناک ہے۔ دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں کھڑا ہمیں للکار رہا ہے اور ہمارا شاعر قوم کے نوجوانوں سے کہہ رہا ہے۔ "ٹھہرو! میں تمھیں ایک نیا گیت سناتا ہوں۔ میں نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔ یہ ادب برائے ادب ہے۔ یہ نئے دور کی ابتدا ہے۔" ہم ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی پر سوار پاکستان کی منزل کا رُخ کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر قدم پر ایک نیا بھنور دکھائی دے رہا ہے اور کشتی کے ایک کونے میں ہمارا آرٹسٹ اپنے رباب کے تار درست کر رہا ہے۔

سلیم! مجھے تمھاری تحریر نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ایک شاعر اور ادیب کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ بلکہ میں اس لیے متاثر ہوا ہوں کہ تم نے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اُس مسئلے کی طرف توجّہ دی ہے جس کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات وابستہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ تمھارے شعر و ادب کے نئے دور کی ابتدا ہو۔ میں اس مباحثے میں حصّہ نہیں لوں گا۔ اب ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن تمھاری تقریر ضرور سُنوں گا۔"

آفتاب نے کہا۔ "بھئی آج سلیم کی جگہ تم شاعر بن گئے ہو۔ اب خدا کے لیے لیٹ جاؤ اور سلیم! تم اپنے کمرے میں جا کر تقریر کی تیاری کرو۔"

شام کے آٹھ بجے ہوسٹل کے کامن روم میں مباحثہ ہو رہا تھا۔ صدارت کے فرائض کالج کا ایک نوجوان پروفیسر سرانجام دے رہا تھا۔ اختر اپنے کمرے کی بجائے کامن روم کے قریب ایک اور کمرے میں لیٹا مباحثے میں حصّہ لینے والوں کی تقریریں سُن رہا تھا۔ منصور اُس کی تیمارداری سے زیادہ آزادی کے ساتھ حُقّہ پینے کی نیّت سے اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ چارپائی کے پاس باہر کی طرف کھلنے والے دریچے سے مقررین کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

الطاف اور اس کے ساتھیوں کی تقریروں میں پاکستان کے خلاف وہی دلائل تھے۔ جو بارہا ہندو اخبارات میں دہرائے جا چکے تھے۔ اختر کے ہونٹوں پر کبھی حقارت آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور کبھی غصّے کی حالت میں وہ اپنے ہونٹ چبانے لگتا اور منصور تقریر کے الفاظ سے زیادہ اس کے چہرے سے متاثر ہو کر بار بار کہتا۔ "بکواس کر رہا ہے گدھا کہیں کا۔ اب آفتاب اس کی خبر لے گا۔"

الطاف اپنے گاندھی بھگت ساتھیوں کا ایک منظم گروہ لے کر آیا تھا اور وہ اس کی تقریر کے دوران میں بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ جب آفتاب کی باری آئی تو اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت زیادہ خفا ہو چکا ہے۔ اس کی تقریر پاکستان کے مخالفین کے خلاف ایک اعلانِ جنگ تھی اور

www.allurdu.com

سننے والے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر صدر کا احترام ملحوظِ خاطر نہ ہوتا تو وہ شاید اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ کرنے پر اُتر آتا۔

پاکستان کی حمایت میں ایک ایم اے کے طالب علم کی تقریر نہایت عالمانہ تھی لیکن اپنی باریک آواز کے باعث وہ سننے والوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکا۔

بالآخر صاحبِ صدر نے کہا: "اب مسٹر سلیم موضوع کے حق میں تقریر کریں گے۔"

سلیم کرسی پر بیٹھا ان کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جن پر اُس نے رات کے وقت تقریر لکھی تھی۔ یہ تقریر اُسے حفظ ہو چکی تھی لیکن الطاف کی تقریر ناخوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھی جس نے اس کے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ سلیم اس کی تقریر کے دوران میں محسوس کر رہا تھا کہ خیالات کے وہ "حسین پھول" جو اس نے جمع کیے ہیں اپنی رنگینی اور رعنائی کے باوجود الطاف کا منہ بند کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس نے گالیوں کے جواب میں شعر لکھے ہیں۔ الطاف کے بعد اس کے ساتھیوں کی تقریروں کے دوران میں بھی وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور اس کے ذہن میں نئے نئے دلائل اور نئے نئے الفاظ آ رہے تھے، یہاں تک کہ جب اُسے تقریر کے لیے بلایا گیا تو اُسے یقین نہ تھا کہ وہ کیا کہے گا۔ وہ جھجکتا ہوا کرسیٔ صدارت کے قریب پہنچا تو اپنی لکھی ہوئی تقریر سے زیادہ مخالفین کی تقریروں کے الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

الطاف نے اچانک کہہ دیا: "سلیم صاحب! پاکستان کے متعلق تقریر کریں گے یا کوئی قصیدہ سنائیں گے؟"

آفتاب نے فوراً جواب دیا: "سلیم صاحب ملّت فروشوں کا مرثیہ پڑھیں گے۔"

حاضرین تھوڑی دیر شور مچاتے رہے۔ بالآخر صدر نے اٹھ کر انھیں خاموشی کی تلقین کی۔ سلیم نے مذبذب سی آواز میں تقریر شروع کی۔ چند فقرے کہنے کے بعد سلیم نے لکھے ہوئے کاغذات ایک نظر دیکھنے کے بعد میز پر رکھ دیے اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ تقریر کرنے لگا۔ الفاظ رُک رُک کر اس کی زبان پر آ رہے تھے۔ حاضرین میں کانا پھوسی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اچانک وہ سنبھل گیا۔ اس کی آواز صاف اور بلند ہوتی گئی۔ وہ خیالات کی ایک نئی رَو میں بہہ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"حضرات! اگر الطاف صاحب اور ان کے ساتھی متحدہ ہندوستان کی حمایت میں تقریریں کرنے سے نہیں شرماتے تو مجھے پاکستان کے متعلق قصائد لکھنے میں عار نہیں۔ متحدہ ہندوستان الطاف صاحب کو ہندو اکثریت کی غلامی کا طوق پہناتا ہے اور پاکستان مجھے ایک آزاد قوم کے فرد کی حیثیت عطا کرتا ہے، اگر انھیں ہندو کی دائمی غلامی اور ذلّت کا شوق ہے تو مجھے عزت اور آزادی سے محبت ہے لیکن کاش! یہ مسئلہ میری اور الطاف صاحب کی ذات یا اُن لوگوں تک محدود ہوتا جنھوں نے اس بحث میں حصّہ لیا ہے۔ اس صورت میں ہماری بحث اپنے اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی تک محدود رہتی لیکن یہ دو قوموں کا مسئلہ ہے۔ یہ دو نظریوں اور دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان کے مفادات کی ٹکر ہے۔ ہندو متحدہ ہندوستان چاہتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنی اکثریت کے

www.allurdu.com

بل بوتے پر مسلمانوں پر دائمی تسلّط رکھ سکے ۔ درّہ خیبر سے لے کر آسام کی پہاڑیوں تک رام راج کے جھنڈے لہرا سکے اور حکومت کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد وہ کسی دقّت کے بغیر مسلمانوں کو برہمو سماج کا قابلِ نفرت حصّہ بنا سکے ۔

مسلمان پاکستان چاہتے ہیں ۔ اس لیے کہ وہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کو بڑھنے، پھولنے اور پنپنے کیلیے آزاد وطن کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی کا بوجھ اٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ جب مسلمان پاکستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اُس کے ذہن میں وہ دفاعی مورچہ ہوتا ہے جہاں اُسے ہندو اکثرّیت کے جارحانہ مقاصد سے نجات مل سکتی ہے اور جب ہندو متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسی وسیع شکارگاہ ہوتی ہے جہاں اکثرّیت کے بھیڑیے کسی روک ٹوک کے بغیر اقلیّت کی بھیڑوں کا شکار کھیل سکتے ہیں۔

ہندو، پاکستان کے خلاف متّحد اور منظم ہو چکا ہے ۔ مہا سبھائی ہندو، کانگرسی ہندو، سناتن دھرمی ہندو، آریہ سماجی ہندو، تشدّد پر ایمان رکھنے والا ہندو اور عدم تشدّد کی تبلیغ کرنے والا ہندو، بظاہر مسلمانوں کو امن اور شانتی کا پیغام دینے والا ہندو، اور در پردہ مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کرنے والا ہندو سب ایک ہو چکے ہیں اور اگر ہم نے اپنے مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر لیں تو ہمیں بھی ایک ہونا

پڑے گا۔ یاد رکھیے! اگر ہم اجتماعی نجات کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے تو مشترکہ تباہی میں ایک دوسرے کے ساتھی ضرور ہوں گے ۔

ہندو سارے ہندوستان میں اپنے دیوتاؤں کے مندر تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے اس ماضی کی طرف لوٹنے کے لیے بے قرار ہے جب وہ اپنے گناہوں کے بدلے اچھوت کا بلیدان دیا کرتا تھا۔ اور مسلمان ہندوستان کے ایک گوشے میں اپنی اُن مساجد کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں جہاں توحید کے چراغ روشن ہیں۔ جہاں ذات پات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو عدل اور مساوات کا پیغام ملتا ہے ۔ہندو اکھنڈ ہندوستان میں برہمن کا اقتدار چاہتا ہے، مسلمان پاکستان میں خدا کی بادشاہت چاہتا ہے لیکن آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ نیشنلسٹ یا گاندھی بھگت مسلمان کیا چاہتے ہیں ؟"

آفتاب نے دبی زبان سے کہہ دیا۔" دال روٹی" اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

سلیم نے قدرے توقف کے بعد اپنی تقریر پھر شروع کی :-

" یہ لوگ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کے علیٰحدہ وجود سے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور رجعت پسندی ہے اور ان خطرناک الزامات سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں کو متحدہ قومیّت کی رسّی سے جکڑ کر اس تاریک گڑھے میں پھینک دیا جائے، جہاں سے ابھی

www.allurdu.com

تک اچھوت کے کراہنے کی آواز آرہی ہے۔ یہ وطن پرست ہیں اور وطن کا دیوتا دس کروڑ مسلمانوں کا بلیدان لیے بغیر خوش نہیں ہو سکتا۔ یہ اقتصادیات کے ماہر ہیں اور انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ پاکستان بھوکا اور ننگا ہوگا لیکن کاش! یہ دردمندانِ قوم ذرا جرأت سے کام لیں اور یہ کہہ دیں کہ اُنھیں اپنی دال روٹی کی فکر ہے۔ اگر پاکستان بن گیا تو یہ اس منّ و سلویٰ سے محروم ہو جائیں جو ان کے لیے واردھا کے آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔

میں آزادی کی نعمت کو روٹیوں کے ساتھ تولنے کا قائل نہیں، تاہم وہ ہندو جو پاکستان کی بھوک کے تصوّر سے گھلے جا رہے ہیں، اگر حق گوئی سے کام لیں تو انھیں یہ کہنا پڑے گا کہ اگر پاکستان کے زرعی صوبے ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو انھیں گندم کی بجائے کوئی اور غذا تلاش کرنی پڑے گی۔ اگر پاکستانیوں کو کپڑے کی ضرورت ہے تو دنیا بھر کے کارخانہ دار پاکستان کی رُوئی کے محتاج ہیں۔

یہ لوگ فنونِ حرب کے بھی ماہر ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان دفاعی لحاظ سے بھی کمزور ہوگا۔ لہٰذا ان کی قیمتی رائے کا احترام کرتے ہوئے ہمیں پاکستان کے قیام کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر ہندو کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے — پاکستان کی فتح یا شکست کا فیصلہ تو کسی پانی پت کے میدان میں ہوگا لیکن یہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ موت سے پہلے ہی اپنی قبریں کھود چکے ہیں۔ پاکستان کے دفاع کو اگر کوئی خطرہ ہوگا تو وہ ان شکست خوردہ لوگوں کی طرف سے

ہوگا۔ میں انھیں اطمینان دلاتا ہوں کہ اُن کی پیشانیوں پر ملّت فروشی کا جو داغ آج ہم دیکھ رہے ہیں، اسے کل تک ہر شخص پہچان سکے گا۔ یہ لوگ زیادہ عرصہ قوم کو اپنے نیک مشوروں سے مستفید نہیں کر سکیں گے۔ یہ لوگ امن پسند ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے نعرے سے ہندو مہاشے خفا ہو جاتے ہیں اور اس سے آپس کا فساد بڑھتا ہے اور فساد بڑھنے سے گاندھی کی آتما کو دکھ ہوتا ہے لہٰذا اگر مسلمان پاکستان کا خیال ترک کر کے ہندو اکثریت کی دائمی غلامی قبول کر لیں تو نہ ہندو مہاشے خفا ہوگا نہ فساد بڑھے گا اور نہ گاندھی جی کی آتما کو دُکھ ہوگا اور سب سے زیادہ یہ کہ دُنیا ہمیں تنگ نظر اور فسادی کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ یعنی اگر ہم اپنی خوشی سے اکھنڈ ہندوستان کے سیاسی قبرستان میں دفن ہونے کیلیے تیار ہو جائیں تو آثارِ قدیمہ کے ماہرین ہمارا مزار دیکھ کر یہ کہا کریں گے کہ یہ ہے وہ قوم جس نے ہندو کو اپنی شرافت، امن پسندی، نیک نیتی اور وسیع النظری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ یہاں دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کے معماروں کے وہ جانشین دفن ہیں جنھوں نے بیسویں صدی میں ہندو اقتدار کا محل کھڑا کرنے کے لیے اپنے جھونپڑوں کو آگ لگا دی تھی۔ یہ ان امن پسند بھیڑوں کی ہڈّیوں کا انبار ہے جنھوں نے بھیڑیوں کو اپنا نگہبان بنا لیا تھا۔

پاکستان کو اس ملک میں ہم اپنا آخری دفاعی مورچہ سمجھتے ہیں، یہ ہندو فسطائیت کو روکنے کے لیے ہماری آخری دیوار ہے۔ ہم ہندو کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں۔ ہم اس کی آبادی کی نسبت سے ہندوستان کے تین چوتھائی بلکہ اس سے کہیں زیادہ حصّے پر اس کی حکومت کا حق تسلیم کرتے ہیں لیکن ہندو کو اپنی آزادی سے زیادہ

www.allurdu.com

ہمیں غلام بنانے کی فکر ہے۔ جب ہندو مسلمانوں کی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی مثال اُس ڈاکو سے مختلف نہیں ہوتی جو اپنے ہمسائے سے یہ کہہ رہا ہو۔ بھائی دیکھو تم اپنے گھر کے گرد چار دیواری کیوں بنا رہے ہو؟ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو۔ ایسی غلط فہمیوں سے بھائی چارے میں فرق آتا ہے۔ اس لیے میں تمھیں یہ دیوار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہوشیار ڈاکو عام طور پر گھر کے کسی بھیدی کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔ یہ گھر کا بھیدی آ کر مالک سے کہتا ہے' ارے یار! یہ کیا مصیبت ہے کہ تم ساری رات لٹھ اٹھائے دروازے پر پہرا دیتے ہو' جاؤ! اطمینان سے سو جاؤ۔ ورنہ پڑوسی یہ خیال کریں گے کہ تم انھیں چور سمجھتے ہو۔ حضرات! یہ کانگرسی مسلمان ہمارے گھر کے بھیدی ہیں۔"

الطاف اور اس کے چند ساتھی یکے بعد دیگرے احتجاج کے لیے اٹھے لیکن ان کی آواز مخالفین کے نعروں اور قہقہوں میں دب کر رہ گئی "بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ! پاکستان زندہ باد! گھر کے بھیدی مُردہ باد!"

الطاف چلّایا۔ "صاحب صدر! سلیم کی تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔"

آفتاب نے اٹھ کر کہا۔ "نہیں' ہم سُنیں گے!"

اکثریت نے آفتاب کی تائید کی اور صدر نے کہا۔ "میرے خیال میں دونوں فریق یہاں سمجھنے اور سمجھانے کی نیّت سے آئے ہیں۔ اس لیے میں مسٹر سلیم کو تقریر جاری رکھنے کی اجازت دیتا ہُوں۔ اس کے بعد حزبِ مخالف کا لیڈر کچھ کہنا چاہے تو میں اُسے موقع دینے کے لیے تیار ہُوں۔"

حاضرین کی اکثریت نے تالیوں کے ساتھ صدر کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور سلیم نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کی :-

"حضرات! اگر میں پاکستان کو محض ایک علمی اور نظریاتی مسئلہ سمجھتا' تو شاید اس بحث میں حصّہ نہ لیتا۔ مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ پاکستان کا مسئلہ ہماری مَوت و حیات کا مسئلہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ طوفان بڑی تیزی سے آ رہا ہے اور جو لوگ آج پاکستان کا تمسخر اُڑا رہے ہیں' کل اس کی چار دیواری کو اپنی آخری جائے پناہ خیال کریں گے۔ جب دوپہر کی جھلستی ہوئی ہوا چلتی ہے تو منتشر قافلے خود بخود درختوں کی چھاؤں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ میں ہندو کے قہر و غضب سے پریشان نہیں بلکہ اُسے قیامِ پاکستان کے لیے ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔ پاکستان کی مخالفت میں اس کا متحدہ محاذ ہمیں پاکستان کی حمایت میں متحدہ محاذ بنانے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن میں آپ کو اُن نام نہاد مسلمانوں سے خبردار کرنا چاہتا ہُوں جو پاکستان کی مخالفت اور "رام راج" کے جواز میں قرآن پاک کی آیات پیش کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے —— جب بغداد پر تاتاریوں کا حملہ ہونے والا تھا، اس قسم کے لوگوں نے مسلمانوں کو مناظروں میں الجھائے رکھا۔ آج جب ہندو ہم پر یلغار کرنے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کر رہا ہے تو ان لوگوں نے پاکستان کو موضوعِ بحث بنا رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جس وقت تک ہندو کی تیاری مکمل نہیں ہو جاتی، جب تک ان کے مندر اور سکھوں کے گوردوارے بم سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل

www.allurdu.com

نہیں ہو جاتے، یہ لوگ ہمیں ذہنی انتشار میں مبتلا رکھیں گے۔ ان لوگوں کی معاندانہ سرگرمیوں کے باعث شاید پاکستان کے متعلق مسلمانوں کی جد وجہد چند برس اور محض تقریروں، قرار دادوں اور نعروں تک محدود رہے اور ہمیں مورچہ بنانے کی اُس وقت فکر ہو جب دشمن چاروں طرف سے گولہ باری کر رہا ہو۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قیام پاکستان عملی جد وجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری آزادی اور بقا کے دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو رہے ہیں اور ہم اگر مکمّل تباہی نہیں چاہتے تو ہمیں پاکستان یا موت کا نعرہ لگا کر میدان میں آنا پڑے گا۔

ہم ان لوگوں کی چیخ پکار سے پریشان کیوں ہوں، جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیروں کی کشتی میں سوار ہو چکے ہیں۔ جو ربِّ کعبہ سے منہ پھیر کر بھارت کے دیوتاؤں پر ایمان لا چکے ہیں۔ ہمیں اپنی ساری توجّہ اُن لوگوں کی طرف مبذول کر دینی چاہیے جو اسلام کے لیے زندہ رہنا اور اسلام کے لیے مرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو عملی جد وجہد کے لیے تیار کرنا ہے۔ ہمیں ملک کے ہر گوشے میں یہ پیغام پہنچانا ہے کہ اب اپنی عزّت، آزادی اور بقا کے لیے آگ اور خون میں کھیلنے کا وقت آ گیا ہے۔

میرے دوستو! اب تقریروں، قرار دادوں اور بیان بازی کا وقت نہیں۔ عمل اور جرأت کا وقت ہے۔

سلیم کی تقریر کے بعد الطاف اور اس کے ساتھیوں کا جوش و خروش بہت حد تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ صدر نے الطاف کو دوبارہ اسٹیج پر آنے کی دعوت دی، تو وہ قدرے تذبذب کے بعد اٹھا لیکن کسی نے بلند آواز میں نعرہ لگا دیا "گھر کا بھیدی" اور آفتاب نے "لنکا ڈھائے" کہہ کر فقرہ پورا کر دیا۔ کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور الطاف نے اسٹیج تک پہنچنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جب مجلس برخاست ہوئی تو سلیم کے چند دوست اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر ان کی داد و تحسین سننے کے بعد سلیم کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "سلیم صاحب السّلام علیکم!"

یہ دلکش آواز سلیم کے کانوں سے ہوتی ہوئی دل تک اتر گئی۔ سلیم نے وعلیکم السلام کہہ کر پیچھے دیکھا ـــــ ایک خوش وضع نوجوان مسکرا رہا تھا۔ سلیم پہلی نگاہ میں اُسے پہچان نہ سکا۔ لیکن اُس کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ تم نے اسے دیکھا ہے، تم اسے جانتے ہو، تم اس آواز سے آشنا ہو۔ دُوسری نگاہ میں ماضی کے حسین اور دلفریب نقوش دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر شعور کی سطح پر آ گئے۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے سادہ اور معصوم مسکراہٹیں رقص کرنے لگیں۔ اس کے کانوں میں دلکش قہقہے گونجنے لگے، وہ بے اختیار "ارشد! ارشد!" کہتا ہوا نووارد سے لپٹ گیا۔ "تم کب آئے؟ تم کہاں تھے؟ اتنی دیر تم کہاں غائب رہے؟ تم نے مجھے خط تک نہیں لکھا" سلیم جواب کا انتظار کیے بغیر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔

اچانک اُسے اپنے ارد گرد دوسرے لڑکوں کی موجودگی کا احساس ہُوا۔

www.allurdu.com

اور اُس نے کہا۔ "چلو کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

ارشد اس کے ساتھ چل دیا۔ سلیم نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ بجلی کا بٹن دبایا اور ارشد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ قدرے اطمینان سے اپنے سوالات دہرا رہا تھا۔

ارشد نے ان سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت بیان کر دی۔

"میں امرتسر کے میڈیکل سکول سے فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔ اب تم مجھے چھوٹا سا ڈاکٹر کہہ سکتے ہو۔ فوج کو اپنی خدمات پیش کر چکا ہوں۔ خیال ہے کہ جلد ہی بُلا لیا جاؤں گا۔ لاہور میں میرے خالو بیمار تھے۔ میں ابّا جان کے ساتھ اُن کی تیمارداری کے لیے آیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اُن کی مزاج پرسی سے زیادہ تمھیں دیکھنے کی خواہش تھی۔ شام کو یہاں پہنچا تو مباحثہ ہو رہا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ تمھاری تقریر بھی سُن لی۔ اگر پاکستان کے لیے کوئی فوج بھرتی کر رہے ہو تو میرا نام بھی لکھ لو۔"

سلیم نے پوچھا۔ "لاہور کب آئے؟"

"بس ہم کوئی چار بجے یہاں پہنچے تھے۔"

"لیکن تمھیں میرے متعلق کیسے معلوم ہوا؟"

"بھئی میں تمھارے گاؤں سے بھی ہو آیا ہوں۔"

"کب؟"

"پچھلے مہینے آخری ہفتے کے روز میں، ابّا جان اور امّی وہاں گئے تھے رات ہم وہاں رہے اور اتوار کی شام واپس چلے آئے۔"

"اور اس کے بعد بھی تم نے مجھے خط نہ لکھا!"

"بھئی میں نے خط کی بجائے خود لاہور آنے کا ارادہ کیا تھا۔"

"تو پھر مجھے تمھارے خالو جان کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ انھوں نے بیمار ہو کر تمھیں اس نیک ارادے کی تکمیل کا موقع دیا — اچھا میں تمھارے لیے کھانا منگواتا ہوں۔ ابھی تک میں نے خود بھی نہیں کھایا۔"

ارشد نے جواب دیا۔ "بھئی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اب بہت دیر ہو گئی ہے اور مجھے ماڈل ٹاؤن پہنچنا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

"نہیں۔ تم ماڈل ٹاؤن نہیں جاؤ گے۔ میں تمھارے لیے چارپائی اور بستر کا انتظام کرتا ہوں۔ تم رات یہیں رہو!"

"لیکن ابّا جان پریشان ہوں گے۔ ہمیں کل دوپہر کو واپس جانا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ علی الصّباح تمھارے پاس آجاؤں گا۔"

"بھئی نہیں، اگر تمھارے ابّا جان کو یہ معلوم ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو تو وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے تمھیں روک لیا ہے۔ صبح میں تمھارے ساتھ جا کر معذرت کر لوں گا۔"

"بھئی یہ تو ابّا جان بھی کہتے تھے کہ میں نہیں آسکوں گا۔"

ہوسٹل کے نوکر نے کمرے کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "سلیم صاحب! کھانا لے آؤں؟"

"ہاں بھئی، دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ۔"

نوکر چلا گیا اور سلیم نے ارشد کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ارشد! میں ایک دوست کی مزاج پرسی کر آؤں۔ پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ اس کے بعد اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

—— * ——

کھانا کھانے کے بعد سلیم اور ارشد بستروں پر لیٹے ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنا رہے تھے۔ ارشد سے اچانک ملاقات پر سلیم کے ذہن میں جو سب سے اہم سوال تھا' وہ ابھی تک اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ یہ اُس کے دل کی وہ مقدس دھڑکنیں تھیں جنھیں اس کے ہونٹوں تک آنا گوارا نہ تھا۔

اچانک ارشد نے کہا "سلیم! بڑے دنوں کی چھٹیوں میں تم امرتسر ضرور آؤ۔ اگر میں اپنے گاؤں گیا تو تمھیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ امّی نے بھی تاکید کی ہے کہ تم ضرور آؤ!"

سلیم نے کہا۔ "بھئی! یہ آج پتہ چلا کہ تم گاؤں کے رہنے والے ہو۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ مجھے گاؤں کی زندگی دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوا ہے۔"

ارشد نے جواب دیا" ہاں بھئی ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے پہلی بار اُس وقت اپنا گاؤں دیکھا تھا جب میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہاں ہماری تھوڑی سی زمین تھی جس کا بیشتر حصّہ دادا مرحوم نے اپنی زندگی میں گروی رکھ دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ابّا جان نے اپنی تعلیم کے اخراجات پورا کرنے کے لیے باقی کھیت بھی گروی رکھ دیے۔ ملازم ہونے کے بعد مکان انھوں نے اپنے چچازاد بھائیوں کے حوالے کر دیا اور وہاں سے یہ عہد کر کے نکلے کہ وہ گاؤں میں اس وقت تک آباد نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنی زمین نہیں چھڑا لیتے۔ اب ابّا جان نے نہ صرف وہ زمین چھڑا لی ہے بلکہ کچھ اور خرید لی ہے' گاؤں سے باہر ہم نے ایک چھوٹی سی کوٹھی بھی بنوا لی ہے۔ سلیم تم ضرور آؤ۔ عصمت اور راحت بھی تمھیں بہت یاد کرتی ہیں۔ عصمت ابھی تک اپنی سہیلیوں کو تمھاری کہانیاں سنایا

کرتی ہے۔"

"وہ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟" سلیم نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"عصمت دسویں میں ہے اور راحت ساتویں میں۔"

سلیم دو ننھے اور معصوم چہروں پر زمانے کی تبدیلیوں کا تصوّر کرنے لگا اور ماضی کے دلفریب نقوش اُسے موہوم تصویریں نظر آنے لگے۔ وہ بچپن کے بے اختیار قہقہوں کو جوانی کی سنجیدہ مسکراہٹوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا عصمت اب بڑی ہوگئی ہے۔ رواج کے ہاتھ اس کے چہرے پر نقاب ڈال چکے ہوں گے۔ اب وہ اُس کے لیے پھولوں کے گلدستے نہیں بنا سکے گا۔ اب وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر یہ نہیں کہہ سکے گا۔ "دیکھو! اسے گرا نہ دینا۔" وہ ان دنوں' مہینوں اور برسوں سے خفا تھا جو اس کی شاہراہ حیات کے ہر رنگین اور دلکش نقش کو اپنی آغوش میں چھپا رہے تھے۔

ارشد سو گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سلیم کو بھی نیند آ گئی۔ خواب میں وہ ماضی کی دیواریں پھاندتا ہوا اس رنگین وادی میں جا پہنچا جہاں بچپن اچھلتا کودتا اور قہقہے لگاتا ہے۔

بڑے دنوں کی چھٹیوں میں سلیم کو سیدھا اپنے گاؤں جانے کی بجائے امرتسر اُترنا پڑا۔ ارشد گزشتہ ملاقات میں اسے بتا چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے نوکری سے مستعفی ہو کر اپنی دکان کھول لی ہے۔ وہ امرتسر میں اپنے مکان کا پتہ بھی اُس کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

www.allurdu.com

دوپہر کے وقت دکان بند تھی، اس لیے سلیم نے تانگے والے کو مکان کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ تانگے والے کو ڈاکٹر شوکت کا مکان تلاش کرنے میں دیر نہ لگی۔ اُس نے محلّے میں داخل ہو کر جس دکاندار سے مکان کا پتہ پوچھا وہ خود ہی ساتھ آکر اُسے مکان کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ سلیم نے تانگے سے اپنا سوٹ کیس اُتار کر دروازے کے سامنے رکھ دیا اور تانگے والے کو کرایہ ادا کرنے کے بعد دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" اور پیشتر اس کے کہ سلیم کچھ کہتا، اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

سلیم نے قدرے تذبذب کے بعد پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُسی لڑکے نے پھر ایک بار کواڑ کھول کر اپنا سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" وہ دوبارہ دروازہ بند کرنے کو تھا کہ سلیم نے جلدی سے کہا۔ "ارے امجد! تم مہمانوں کے ساتھ اسی طرح پیش آیا کرتے ہو؟ ارشد کہاں ہے؟"

"بھائی جان باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

کسی نے امجد کا کان پکڑ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا اور کہا۔ "آپ لاہور سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں!" سلیم نے راحت کو پہچانتے ہوئے جواب دیا۔

راحت کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا اور وہ "امی جان! آپا جان!" کہتی ہوئی واپس بھاگ گئی۔

ماں کی آواز آئی۔ "ارے کیا ہے؟"

"امی جان وہ آگئے ہیں؟"

"کون سلیم؟"

"ہاں وہ آگئے ہیں۔"

عصمت کتاب پھینک کر اپنے کمرے سے نکلی اور دروازے کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگی۔ اچانک سلیم نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ عصمت جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ماں نے کہا۔ "راحت تم بیٹھک کا دروازہ کھول کر بھائی کو اندر بٹھاؤ، آج خدا جانے نوکر کہاں غارت ہو گیا ہے۔"

راحت نے امجد سے کہا۔ "امجد تم جاؤ انھیں بیٹھک میں لے آؤ۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

امجد نے جواب دیا۔ "بس میں نہیں مانتا تمھارا کہنا۔ تم نے میرا کان کیوں کھینچا تھا۔"

"تھپڑ لگاؤ اس کے منہ پر۔" ماں نے بگڑ کر کہا۔

"بڑا کمینہ ہے یہ۔" عصمت نے آگے بڑھ کر کہا۔

امجد ایسے مہمان کی آمد پر قطعاً خوش نہ تھا۔ جس نے آن کی آن میں گھر کی فضا بدل دی تھی۔ تاہم اسے مجبوری سمجھتے ہوئے وہ مکان سے باہر نکل آیا اور سلیم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آؤ جی بیٹھک میں!"

اتنی دیر میں راحت بیٹھک کا دروازہ کھول چکی تھی۔ سلیم اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اندر داخل ہوا ـــــ راحت تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی کہ اُس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ سلیم نے سلام کیا۔

وہ بولی "بیٹا جیتے رہو۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم تمھارے متعلق ہی باتیں

www.allurdu.com

کر رہے تھے۔ ارشد ابھی باہر گیا ہے ۔ بیٹھ جاؤ بیٹیا! راحت! تم نے بھائی کو سلام نہیں کیا!" اور وہ ایک شرارت آمیز تبسّم کے ساتھ "بھائی جان السّلام علیکم" کہہ کر ساتھ والے کمرے میں غائب ہو گئی۔ عصمت دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ راحت نے اس کی طرف دیکھ کر دبی زبان میں کہا۔ "آپا جان! اب تو وہ بہت بڑے ہو گئے ہیں۔"

"چڑیل چُپ رہو!" عصمت اُسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے دُور لے گئی۔

بیٹھک میں ان کی ماں سلیم سے کہہ رہی تھی۔ "بیٹا تم آرام سے بیٹھو، ارشد ابھی آجائے گا۔ میں تمھارے لیے چائے تیّار کراتی ہوں۔ امجد! تم اپنے بھائی کے پاس بیٹھو!"

وہ چلی گئی تو سلیم امجد کی طرف متوجّہ ہوا۔ "امجد ادھر آؤ!" امجد جھجکتا ہُوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا۔ امجد پڑوس میں اپنے ایک ہم جماعت کے گھر جا کر پتنگ اڑانا چاہتا تھا اور وہ اس خیال سے پریشان تھا کہ جب تک ارشد نہیں آئے گا اُسے چھٹّی نہیں ملے گی لیکن سلیم بچّوں کو بہلانا جانتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

سلیم نے پوچھا۔ "امجد! تم اپنے گاؤں کب جا رہے ہو؟"

"ہم کل جائیں گے۔ آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں نا؟"

"ہاں! تم میرا گاؤں دیکھ چکے ہو لیکن تم اس وقت بہت چھوٹے تھے۔"

"بھلا گاؤں میں سانپ ہوتے ہیں؟"

"ہوتے ہیں۔"

"بہت بڑے بڑے سانپ جو آدمی کو سالم نگل جاتے ہیں؟"

"نہیں ایسے سانپ نہیں ہوتے۔ یہ تمھیں کس نے بتایا؟"

"راحت نے۔ وہ کہتی تھی کہ سانپ جب پھنکارتے ہیں تو آگ نکلتی ہے اور اگر انھیں ڈنڈا مارا جائے تو ڈنڈے کو آگ لگ جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ گاؤں میں ریچھ، شیر اور چیتے ہوتے ہیں۔"

"وہ تم سے مذاق کرتی ہو گی۔"

"مجھے معلوم ہے' وہ مذاق کرتی ہے۔ یہ جانور جنگلوں میں ہوتے ہیں لیکن بھوت اور جن گاؤں میں ضرور ہوتے ہوں گے اور رات کے وقت وہ لوگوں کو ڈراتے بھی ہوں گے؟"

"نہیں، اگر انسان خود ڈرپوک نہ ہو تو اسے کوئی نہیں ڈراتا۔"

"آپ کو کبھی نہیں ڈرایا کسی نے؟"

"نہیں۔"

"راحت کہتی ہے کہ بھوت بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بچّوں کو چمٹ جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ اُسے ٹھنڈے پانی میں غوطے نہ دیے جائیں۔ بعض بھوت بہت ضدی ہوتے ہیں اور ان سے جان چھڑانے کے لیے منہ کو سیاہی لگا کر گدھے پر سواری کرنی پڑتی ہے۔ بھلا یہ سچ ہے؟"

سلیم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا اور راحت دوسرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کھڑی اپنے دانت پیس رہی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے نا؟"

سلیم نے کہا۔ "تمھیں یہ سب باتیں راحت نے بتائی ہیں؟"

www.allurdu.com

" ہاں جی۔ وہ بہت جھوٹ بولتی ہے۔ وہ کہتی تھی گاؤں میں جب بارش ہوتی ہے تو پانی لوگوں کے گھروں تک پہنچ جاتا ہے اور جو تیرنا نہیں جانتے وہ ڈوب جاتے ہیں۔ اس لیے مجھے گاؤں میں نہیں جانا چاہیے ۔"

سلیم نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔" وہ تم سے مذاق کرتی ہے۔"

امجد بولا۔" یہ بھی کہتی ہے کہ رات کے وقت جب گاؤں کے لوگ سو جاتے ہیں تو چوہے اُن کے اوپر چڑھ کر ناچتے ہیں اور گیدڑ کھیتوں سے نکل کر۔"

راحت نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر اُسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکا۔

سلیم کی توجہ امجد کی طرف تھی، اس لیے وہ راحت کو نہ دیکھ سکا۔ امجد کے اچانک خاموش ہو جانے پر اس نے کہا۔" ہاں بھئی! گیدڑ کیا کرتے ہیں کھیتوں سے نکل کر ؟"

" بھائی جان! یہ بکواس کرتا ہے ۔" راحت یہ کہتے ہوئے اندر آ گئی۔

امجد بولا۔" ہونہہ! تم نے کہی نہیں تھیں مجھ سے یہ باتیں ؟"

راحت نے کہا۔" بھائی جان، یہ کانگرسی ہے۔ اس کی باتوں پر یقین نہ کیجیے۔ یہ کٹّر کانگرسی ہے۔"

راحت نے امجد کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کانگرسی کہلانا اُس کے لیے ایک گالی کے مترادف تھا اور کٹّر کانگرسی کہلانا اس کے نزدیک بد ترین گالی تھی۔ بالخصوص جب سے اس نے مہاتما گاندھی کی تصویر دیکھی تھی، کانگرسی بن جانے کا تصوّر بھی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اُس کے ذہن میں کانگرس اور مہاتما گاندھی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ اس نے غصّے میں آ کر کہا۔" مجھے کانگرسی کہو گی تو میں تمھاری ساری باتیں بتا دوں گا۔ تم نے مجھے

مینڈکوں، کچھووں اور نیولوں کے متعلق بھی بتایا تھا کہ وہ سردیوں کی راتوں میں بچّوں کے ساتھ آ کر سو جاتے ہیں، اور بھینسے مکان کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں۔ بھینسے کے متعلق تو بڑی آپا نے بھی کہا تھا —"

عصمت نے دوسرے کمرے سے آواز دی۔" امجد!"

اور اس نے جواب دینے کی بجائے فریاد کے لہجے میں کہا۔" آپا جان! چھوٹی آپا مجھے کٹّر کانگرسی کہتی ہیں۔"

" امجد! اِدھر آؤ!" اندر سے دوبارہ آواز آئی۔

امجد اٹھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا لیکن راحت نے جلدی سے اس کا کان پکڑ لیا اور اُسے کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

سلیم ہنس رہا تھا۔ امجد چند منٹ کے بعد دوبارہ اُس کے کمرے میں آیا تو وہ کافی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد آ گیا۔ سلیم نے اس کے ساتھ چائے پی اور شام کے وقت دونوں سیر کے لیے نکل گئے۔ رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد سلیم، ارشد، ڈاکٹر شوکت اور ان کی بیوی کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ راحت اور امجد خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ سلیم عصمت کی غیر حاضری کے باعث اس محفل میں ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔

گفتگو کا موضوع پاکستان تھا۔ سلیم کی گرمجوشی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔" خدا کا شکر ہے کہ تم جیسے نوجوان اس مسئلے کی اہمیّت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہندو بہت زیادہ تیار ہو چکا ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ابھی تک اس بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہمیں ایک وطن کی ضرورت ہے۔ تم نوجوانوں کو بہت کام کرنا ہے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ طوفان

آچکا ہوگا اور ہم ابھی تک یہ بحث کر رہے ہوں گے کہ ہمیں کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

ارشد کی ماں بولی۔"بھئی سلیم! ارشد تمھاری تقریر کی بہت تعریف کرتا تھا۔ اگر یہاں تمھارے پاس اس کی کوئی نقل ہے تو ہمیں بھی سُنا دو۔"

"جی، جو تقریر میں نے کی تھی، وہ تو مجھے اُسی دن بھول گئی تھی۔ میں نے فقط مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے پر اکتفا کیا تھا۔"

"اچھا جو لکھی تھی، وہ سنا دو!"

سلیم نے اپنا سوٹ کیس کھول کر چند کاغذ نکالے اور انھیں پڑھ کر سُنانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے کئی بار "خوب اور بہت خوب" کہہ کر داد دی اور اختتام پر کہا۔"بھئی خدا تمھیں ہمت دے۔ تم پاکستان کے لیے بہت کام کر سکو گے!"

ارشد کی ماں بولی۔"بیٹا! جب تم عصمت اور راحت کو عجیب وغریب کہانیاں سنایا کرتے تھے، میں اُسی وقت کہا کرتی تھی کہ خدا نے تمھیں بہت اچھا ذہن دیا ہے۔"

راحت نے آہستہ سے امجد کے کان میں کچھ کہا اور وہ بلبلا اٹھا۔"ابّا جان راحت مجھے پھر کانگرسی کہتی ہے۔"

راحت کو ماں نے ڈانٹا اور وہ رنجیدہ ہونے کی بجائے ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

راحت اور امجد کے جھگڑے گھر کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے تھے۔ راحت اُسے چھیڑتی وہ ماں یا باپ کے پاس جا کر فریاد کرتا۔ کبھی کبھی راحت کو ڈانٹ پڑتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے امجد کے ساتھ بول چال بند

کر دیتی۔ پھر امجد کی باری آتی۔ وہ دوسروں سے نظر بچا کر اُس کا منہ چڑاتا۔ جب اس پر بھی وہ متوجہ نہ ہوتی تو وہ اُس کے ہاتھ سے کتاب، قلم یا سوئیٹر بننے کی سلائیاں چھین کر ہنستا ہوا بھاگ جاتا۔ راحت اُس کا پیچھا کرتی۔ کبھی کبھی امجد جان بوجھ کر اس کے ہاتھ آجاتا اور راحت اُسے پیٹنا چاہتی لیکن وہ ہاتھ جو غصّے سے بلند ہوتے، امجد کے حسین گالوں تک پہنچتے پہنچتے رُک جاتے۔"پھر کرو گے شرارت؟" وہ اس کا کان پکڑ کر کہتی۔

"نہیں! نہیں! آپا جان معاف کر دو" وہ ہنستے ہوئے کہتا اور آپا جان بھی اپنا غصّہ بھول کر ہنس پڑتیں اور اگر کبھی راحت کچھ دیر کے لیے سچ مچ خفا ہو جاتی تو امجد محسوس کرتا کہ گھر کی فضا پر اُداسی چھا رہی ہے۔

آج بھی جب راحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد امجد کو سلیم، ارشد اور اپنے والدین کی محفل میں تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ کچھ دیر اُس نے اپنے دل پر جبر کیا۔ بالآخر وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ راحت جو عصمت کے پاس بیٹھی اُس سے کھُسر پھُسر کر رہی تھی، دبی زبان میں بولی۔"آپا یہ کانگرسی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

رات کے وقت یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ سلیم، ارشد کی والدہ اور بچّوں کے ساتھ ان کے گاؤں جائے گا اور وہ تین دن وہاں رہے گا۔

چنانچہ صبح دس بجے کے قریب وہ ان کے ساتھ امرتسر سے اجنالہ کی طرف جانے والی موٹر پر سوار ہو گیا۔ ڈاکٹر شوکت اپنی مصروفیات کے باعث اُن کا ساتھ نہ دے سکے۔

www.allurdu.com

اجنالہ سے چند میل آگے ارشد نے ڈرائیور کو لاری کھڑی کرنے کے لیے کہا۔ گاؤں کے چار آدمی جنھیں ڈاکٹر شوکت کے چچا زاد بھائی نے سامان اٹھانے کے لیے بھیجا تھا، سڑک پر کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ ارشد نے سامان اُن کے حوالے کیا اور یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل گاؤں کی طرف چل دیے۔

ارشد کی والدہ اور عصمت سیاہ بُرقعے پہنے ہوئے تھیں اور راحت نے موٹر سے اُترنے کے بعد برقعہ اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔

ارشد سلیم سے کہہ رہا تھا۔ "یہ راحت بڑی چڑیل ہے پچھلے دنوں اسے خیال آیا کہ برقع پہننے سے چھوٹی لڑکیاں بھی معتبر بن جاتی ہیں، چنانچہ اس نے ہمیں برقع سلوانے پر مجبور کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کر دی۔ اب اس کی جان عذاب میں ہے۔ اگر ایک دن برقع پہن لیتی ہے تو دو دن دوپٹے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی۔ ابھی ہم گاؤں پہنچیں گے تو وہاں کے بچّوں پر رعب ڈالنے کے لیے فوراً برقع پہن لے گی۔"

کوئی دو میل پگڈنڈی پر چلنے کے بعد ارشد نے سامنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سلیم! وہ ہمارا گاؤں ہے اور وہ آم کے درخت کے ساتھ ہمارا نیا مکان ہے۔ وہ درخت بہت پُرانا ہے، میرے دادا نے لگایا تھا۔"

سلیم دو دن وہاں رہا۔ اس عرصہ میں راحت اور امجد اُس کے ساتھ کافی مانوس ہو چکے تھے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد سلیم کافی دیر ارشد، راحت، امجد اور ان کی والدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ گزشتہ چند سال کے عرصے میں اس کے گاؤں میں کئی ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جو سننے والوں کے لیے بیحد دلچسپ تھے۔ چچا اسماعیل گاؤں کی زندگی میں نئے قہقہوں اور نئی مسکراہٹوں

کا اضافہ کر چکا تھا — چودھری رمضان سے کئی اور بدحواسیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ کاکو عیسائی اور ہری سنگھ لوہار کی لفظی جنگ کئی نئے مراحل طے کر چکی تھی۔ سلیم انھیں یہ واقعات سناتا اور کبھی کبھی اُسے ان کے علاوہ ساتھ والے کمرے سے کسی کے دبے دبے میٹھے اور دلفریب قہقہوں کی آواز بھی آتی اور اسے اس دیوار کا احساس ہونے لگتا جو وقت نے اس کے اور عصمت کے درمیان حائل کر دی تھی۔

دوسری رات وہ انھیں ایک ادبی رسالے سے اپنا مضمون "میرا گاؤں" پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اُس کی کرسی کمرے کے ایک کونے میں میز کے قریب تھی جس پر لمپ جل رہا تھا۔ ارشد اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور کمرے کے دوسرے سرے پر ایک چارپائی پر ارشد کی والدہ، امجد اور راحت بیٹھی ہوئی تھیں۔ عصمت ساتھ والے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ماں نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی دبے پاؤں آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سلیم کو اس کمرے میں اُس وقت اس کی موجودگی کا احساس ہوا جب کسی واقعہ پر وہ ہنس رہے تھے اور دبے دبے قہقہوں کی آواز ساتھ والے کمرے کی بجائے اب اس کمرے کے کونے سے آ رہی تھی۔

اچانک امجد چلّایا۔ "امّی جان! اب بڑی آپا بھی مجھے کانگرسی کہتی ہیں۔" اس پر سب ہنس پڑے اور عصمت اپنا سارا وجود سمیٹ کر ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد عصمت راحت کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور امجد چوکنّا ہو کر سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ عصمت نے غصّے کی حالت میں اُسے گردن سے پکڑ کر پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "کانگرسی" پیچھے ہٹو!"

www.allurdu.com

امجد اپنے مطلب کی کوئی بات تو نہ سُن سکا، تاہم اُسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ کانا پھوسی اُس کے سوا کسی اور کے متعلق نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی مدافعت کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

راحت نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا "بھائی جان! اُس پیر کا واقعہ سنایئے جو آپ کا گھوڑا خریدنے آیا تھا۔"

امجد گھوڑا خریدنے والے پیر کے ساتھ اپنا کوئی تعلق قائم نہ کر سکا تاہم اُس نے سلیم کو ایک بات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا۔ وہ بولا۔ "بھائی جان! یہ بات بڑی آپا نے چھوٹی آپا کے کان میں کہی ہے۔ میں سُن رہا تھا۔"

ماں نے ڈانٹا "تم بہت شریر ہو گئے ہو۔"

امجد اب محسوس کر رہا تھا کہ ہر معاملے میں صاف گوئی سُود مند ثابت نہیں ہوتی ــــ ماں اُسے گھور رہی تھی، راحت اس کی پنڈلیوں میں اپنے ناخن چبھونے کی کوشش کر رہی تھی اور عصمت نظر بچا کر اس کے کان مروڑ رہی تھی۔ وہ زہر کے گھونٹ پی کر اُٹھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں سلیم کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھا۔

سلیم نے پیر ولایت شاہ کی سرگزشت کے ساتھ رمضان کے کوٹھے پر چڑھنے والے بھینسے کا قصّہ بھی سنا دیا۔ اختتام پر جب سب قہقہے لگا رہے تھے، امجد ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو گیا اور ارشد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "بھائی جان! ہم اپنے مکان کے پچھواڑے کسی کو پیال کا ڈھیر نہیں لگانے دینگے۔"

ارشد نے سلیم سے کہا۔ "بھئی جب ہم تمھارے گاؤں گئے تھے، تو اس گھوڑے کی تصویر تمھاری بیٹھک میں لگی ہوئی تھی، مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔"

ارشد کی ماں نے پوچھا "بیٹا کیسے مرا وہ؟"

"یوسف میری غیرحاضری میں اُسے گھر والوں سے چوری چنے کھلا دیا کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ میری غیرحاضری میں اُسے پُوری غذا نہیں ملتی۔ ایک دن اُس نے اُس کے آگے بہت زیادہ چنے ڈال دیے ــــ گھر والوں کو اس کے مرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ یوسف کی محبّت کا شکار ہوا ہے۔"

امجد نے برہم ہو کر کہا۔ "یُوسف کون ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے، وہ تمھارے ساتھ کھیلا کرتا تھا، تم اُسے بھول گئے؟"

امجد نے کہا۔ "جب آپ کو پتہ چل گیا کہ گھوڑے کے آگے اُس نے زیادہ چنے ڈال دیے تھے تو آپ نے اُسے کچھ نہ کہا؟"

"بھئی اُسے کیا معلوم تھا کہ زیادہ چنے کھانے سے گھوڑا مر جائے گا۔"

امجد کو اچانک اپنی مظلومیت کا احساس ہوا اور اس نے کہا۔ "دیکھو جی! ایک دن میں نے بھائی جان کی میز سے دوات گرا دی تو انھوں نے مجھے دو تین تھپڑ لگا دیے۔ ایک دن مجھ سے بڑی آپا کا قلم ٹوٹ گیا تو انھوں نے بھی مجھے پیٹا تھا۔"

ارشد نے ہنستے ہوئے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور کہا "سلیم بھائی! یہ بڑا خطرناک آدمی ہے!"

راحت بولی۔ "بھائی جان! سب کانگرسی خطرناک ہوتے ہیں۔" اور امجد دانت پیس کر رہ گیا۔

ماں بولی "خبردار! میرے بیٹے کو کسی نے کانگرسی کہا تو....!"

---

www.allurdu.com

اگلے دن سلیم نے اپنے میزبانوں کو خدا حافظ کہا۔ ارشد سڑک تک اُس کے ساتھ آیا اور اُسے موٹر پر بٹھا کر واپس چلا گیا۔ شام کے پانچ بجے سلیم اپنا سوٹ کیس اٹھائے اس پگڈنڈی پر جا رہا تھا جس کے ہر موڑ اور ہر کھیت کی تصویر اُس کے دل پر نقش تھی لیکن اس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک نئے راستے کے نقوش اس کے دل میں اُبھر رہے تھے۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر اُسے بڑ کا وہ درخت نظر آنے لگا جو اس کے مکان کے سامنے تھا اور اس کا تصوّر آم کے اُس درخت تک جا پہنچا جس کی شاخیں ارشد کے مکان پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کاش! یہ درخت اس قدر قریب ہوتے کہ اُن کی شاخیں ایک دوسرے سے مل جاتیں۔ کاش وہ مکان اسقدر پاس ہوتا کہ وہ کسی کے شرمائے ہوئے دبے دبے قہقہوں کو سُن سکتا۔ سلیم کے ذہن میں ماضی کے خیالات کی منتشر کڑیاں ایک زنجیر میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے دل میں نئی اُمنگیں اور نئے ولولے محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے شعور و احساس میں ایک گہرائی آ چکی تھی۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا' اس نے گاؤں سے باہر رہٹ کے پانی سے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب وہ ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگ رہا تھا تو اُس کی دعا میں چند نئے الفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ دعا ختم کر کے اُٹھنے والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اُس کی آنکھیں بند کر لیں اور وہ ہاتھوں اور کلائیوں کو ٹٹولتے ہی چلا اُٹھا "کون مجید ؟"

مجید ہنس پڑا اور وہ اٹھ کر اس کے گلے لپٹ گیا۔ مجید کے ساتھ ایک اور قوی ہیکل نوجوان کھڑا تھا۔ سلیم نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور جواب طلب نگاہوں سے مجید کی طرف دیکھنے لگا۔ مجید بولا۔ "بھلا بتاؤ تو یہ کون ہے ؟"

سلیم نے غور سے اس کی طرف دیکھا' اچانک ماضی کے چند دُھندلے نقوش اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے "ارے داؤد !" وہ چلّایا۔

مجید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "داؤد نکالو ایک روپیہ! دیکھو سلیم! یہ مجھ سے شرط لگاتا تھا کہ تم اسے نہیں پہچان سکو گے"۔

سلیم بولا۔ "بھئی مجھے پہچاننے میں کچھ تکلیف ضرور ہوئی ہے۔ اب اس نے اُسترے سے سر منڈانے کی بجائے بال رکھ لیے ہیں۔ بھئی داؤد! کب آئے ؟"

اُس نے جواب دیا۔ "مجھے کوئی آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ چودھری مجید آئے ہوئے ہیں' اس لیے یہاں چلا آیا۔ اب واپس جا رہا تھا کہ آپ مل گئے"۔

"بس اب تم یہیں ٹھہرو گے!"

مجید بولا۔ "ہاں بھئی' اب تم نہیں جا سکتے۔"

رات کے وقت مجید اور داؤد اپنی فوجی زندگی کے کارنامے سنا رہے تھے ـــــ مجید اب جمعدار ہو چکا تھا اور داؤد ابھی تک سپاہی تھا۔

جنگ کے اختتام کے بعد برطانیہ کی وزارت ہندوستان کو آزادی کے اُس درخت کا پھل تقسیم کرنے والی تھی جسے جرمنی اور جاپان کی گرم ہواؤں سے بچانے کے لیے غلام اقوام سے خون اور پسینے کی بھیک مانگی گئی تھی۔ انگریز بظاہر ہندوستان کی سیاسی جنگ میں ایک فریق کی بجائے ثالث کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ کانگرس جس نے ۱۹۴۲ء میں جاپان کی سنگینوں کے سائے

www.allurdu.com

میں ہندو سامراج کے احیاء کے امکانات دیکھ کر "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا تھا اب مایوسی کی حالت میں ٹوکیو کی بجائے لنڈن کو اپنی توقعات کا مرکز بنا چکی تھی۔

انگریز بہرحال جا رہا تھا۔ کب جا رہا تھا؟ کن حالات میں جا رہا تھا؟ کانگریس کو اس کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس کے سامنے فقط ایک نصب العین تھا اور وہ یہ کہ گورا سامراج جن اختیارات سے دستبردار ہو وہ کالے فاشزم کے ہاتھ آجائیں۔ انگریزی اقتدار کے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور کانگریس چاہتی تھی کہ اس کی ٹمٹماتی لو سے ہندو اقتدار کی مشعل روشن کر لی جائے۔ "شیر برطانیہ" بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے اور وہ ہندوستان کی وسیع شکار گاہ کو چھوڑنے والا تھا اور بھارت کے بھیڑیوں کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "ان داتا! تم جا رہے ہو تو یہ شکار گاہ ہمارے سپرد کر جاؤ۔ دیکھو ہماری اکثریت ہے تمھیں ان بھیڑوں کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جو پاکستان کی چراگاہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ ہماری ہیں۔ ہم ان کی رکھوالی کریں یا شکار کھیلیں، تمھیں اس کے متعلق پریشان ہونے کا حق نہیں۔"

ہندو کے سامنے صرف ایک محاذ تھا اور اس محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ساری قوتیں بروئے کار لا چکا تھا، اور یہ محاذ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ کانگریس ایک طرف اُن جنونیوں کی افواج تیار کر رہی تھی جنھوں نے تاریخ انسانیت میں ظلم، وحشت اور بربریت کے ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا اور دوسری طرف انگریز کے ساتھ اس کی منطق یہ تھی کہ مسلمان ہمارے بھائی ہیں، اس لیے آزاد ہندوستان میں جو ہمارے حصے آتا ہے، وہ ہمیں دے دو جو مسلمان کے حصے آتا ہے، وہ بھی ہمیں دے دو۔ اور صرف یہی نہیں، تم

جانے سے پہلے ہمیں اقتدار کے گھوڑے پر سوار کر دو۔ ہمارے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول دے دو اور مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ کر ہمارے سامنے ڈال دو۔ پھر تم اطمینان سے چلے جاؤ۔ پھر کوئی جھگڑا نہیں ہوگا ــــ کوئی فساد نہیں ہوگا۔ اس ملک میں شانتی ہی شانتی ہوگی ــــ اگر تم نے پاکستان کے نعروں کی طرف توجہ دی تو ہم یہ کہیں گے کہ تم فرقہ دارانہ فساد کی بنیاد رکھ کر جا رہے ہو۔ ہم ہندوستان کی مقدس گائے کے دو ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔

دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ مسلمان پاکستان کو اپنا آخری حصار سمجھ کر طوفان سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتا تھا اور ہندو فاشزم پاکستان کو اپنے جارحانہ مقاصد کے سامنے سدِ سکندری سمجھ کر اس کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہندو فاشزم اپنی پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا لیکن مسلمانوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ اُن کے راستے میں وہ نام نہاد نیشلسٹ مسلمان کانٹے بچھا رہے تھے جو ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض ہندو کے ساتھ قوم کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکے تھے۔ ان کے راستے میں وہ یونینسٹ مسلمان گڑھے کھود رہے تھے جن کے اسلاف نے کبھی سکھوں اور کبھی انگریزوں سے اپنی قوم کے شہیدوں کے خون کی قیمت وصول کی تھی۔ یہ ابن الوقت انگریزی راج کے خاتمہ کے آثار دیکھ کر ہندو فسطائیت کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے۔ پنجاب کو یہ اپنے باپ دادا کی میراث سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور یہ کہ ان کے اقتدار کا طرّہ بلند رہے۔ خواہ یہ مقصد انگریز

www.allurdu.com

کے بوٹ چاٹنے سے حاصل ہو خواہ ہندو کی قدم بوسی سے۔

کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو عملی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کا شیرازہ منتشر رکھنے کے لیے ملّت فروشوں کے گروہ کئی ناموں اور کئی چولوں کے ساتھ میدان میں آچکے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے:۔

کانگرس نے ایک مسلمان کو "راشٹرپتی" کے لقب سے سرفراز کر دیا ہے اس لیے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت نہیں۔"

پنجاب میں فلاں مولوی فلاں پروفیسر نے اپنے تازہ بیان میں کہا ہے کہ مسلم عوام پاکستان نہیں چاہتے۔ لہٰذا پاکستان محض ایک نعرہ ہے۔

سندھ میں فلاں سیّد اور فلاں حاجی پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مضرّت رساں خیال کرتا ہے لہٰذا سمجھ دار مسلمان پاکستان کے مخالف ہوگئے ہیں۔

بلوچستان میں ایک شخص نے قراقلی اتار کر گاندھی ٹوپی پہن لی ہے اس لیے پاکستان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوبہ سرحد کے فلاں خانصاحب نے گاندھی جی پرارتھنا سبھا سے اٹھنے کے بعد یہ بیان دیا کہ گاندھی جی بہت اچھے آدمی ہیں۔ بکری کا دودھ پیتے ہیں مرن برت رکھتے ہیں اور چرخہ کاتتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کی نجات پاکستان بنانے میں نہیں چرخہ کاتنے میں ہے۔"

مسلمان بدحواس تھے۔ پریشان تھے۔ اُن کے کندھوں پر لُولے لنگڑے اور سیاسی بصیرت سے کورے رہنماؤں کی لاشیں تھیں۔ ان پر منافقوں اور

ملّت فروشوں کی شخصیّتوں کے بھوت سوار تھے۔ یہ راہنما مختلف راستوں سے اپنے اپنے گروہ کو اس سیاسی قبرستان کی طرف ہانک رہے تھے جہاں کانگرس ان کے کفن دفن کے انتظامات مکمّل کر چکی تھی۔

ان مایوسیوں میں ایک آواز ڈگمگاتے، اونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے مسلمانوں کے لیے صورِ اسرافیل کا کام دے رہی تھی۔ ایک دُبلا پتلا اور عمر رسیدہ رہنما انھیں منزل کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے نحیف اور لاغر ہاتھوں سے قوم کے سفینے کے پھٹے ہوئے بادبانوں کی مرمّت کرتا اور کبھی دشمن کے چہرے سے مکر و ریا کے نقاب نوچتا۔ اُس کی گرجتی ہوئی آواز سننے والوں کی رگوں میں بجلی کی لہر بن کر دوڑ جاتی۔ وہ کانٹوں کو روندتا ہوا اور مخالفت کی چٹانوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ قائدِ اعظم محمّد علی جناحؒ تھا۔

۱۹۴۵ء میں کانگرس کا رویّہ جس قدر مسلم لیگ کے ساتھ غیر مصالحانہ تھا اسی قدر وہ انگریز کی طرف جھک رہی تھی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب انگریز کو شمالی ہند سے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اب ان جری نوجوانوں کی کوئی قدر نہ تھی جنھوں نے جرمنی اور جاپان کا سیلاب روکنے کے لیے اپنے فراخ سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔ اب برطانیہ کے تجارتی مقاصد کو بڑی بڑی توندوں والے مہاجنوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ مشرق کے ممالک میں امریکہ کے تاجروں کی اجارہ داری کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے برطانوی کارخانہ دار کانگرس کے ٹاٹاؤں، برلوں اور ڈالمیوں سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ کانگرس کے سرمایہ دار سرپرستوں کے گروہ کا لیڈر سیٹھ برلا برطانیہ میں اپنی تجارتی مہم کے لیے گاندھی

www.allurdu.com

کی اشیر باد حاصل کر کے اس حقیقت کی طرف ایک غیر مبہم اشارہ کر چکا تھا کہ انگریز اور کانگرس کے سیاسی سمجھوتے میں برطانوی تاجر اور ہندو مہاجن کی سودا بازی کو ایک لازمی شرط قرار دیا جائے گا۔

مرکز میں عبوری دور کے لیے ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے سلسلہ میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ مرکز میں ہندو اور مسلم نمائندوں کی برابری کے اصول کی مخالف تھی۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے حصے میں سے بھی کم از کم ایک نیشنلسٹ مسلمان کو نامزد کرنے کا حق تسلیم کروانا چاہتی تھی تاکہ بوقتِ ضرورت اسے وار دھا کے سامراجی مقاصد کے رتھ میں جوتا جا سکے۔

بظاہر یہ نیشنلسٹ یا سیاسی یتیموں کا گروہ کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے کی راہ میں رکاوٹ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت یہ وہ بے جان پتھر تھے جن کی آڑ لے کر کانگرس ہندو کی فرقہ وارانہ جنگ کو غیر فرقہ وارانہ رنگ دینا چاہتی تھی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے عام انتخابات مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم ترین مرحلہ تھے۔ کانگرس کو کسی دوسری ہندو جماعت سے مقابلے کا خطرہ نہ تھا۔ وہ ہندو عوام پر یہ ثابت کر چکی تھی کہ اسلام دشمنی یا پاکستان کی مخالفت میں اس کی ذہنیت ہندو مہا سبھا کی ذہنیت سے مختلف نہیں لیکن مسلم لیگ کے سامنے کئی محاذ تھے۔ ہر صوبے میں کسی نہ کسی نام سے ملّت فروشوں کی ٹولیاں موجود تھیں اور انھیں مسلم لیگ کے مقابلہ میں کامیاب کروانے کے لیے کانگرس کے مہاجن اپنی تجوریاں کھول چکے تھے۔

پنجاب میں ابن الوقت یونینسٹوں کا گروہ یہ دیکھ کر کہ اس کے سر سے انگریز کا سایہ اٹھنے والا ہے، اپنے اقتدار کا طرّہ بنیئے کی دھوتی کے ساتھ باندھ چکا تھا۔

بیرونی حملے کی نسبت اندرونی حملہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اقوام کو دشمن سے زیادہ اپنے غدّار تباہ کرتے ہیں اور یہاں غدّار ایک نہ تھا، دو نہ تھے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں کی کوئی بستی، کوئی شہر اور کوئی مجلس ایسی نہ تھی جو ان کے وجود سے خالی ہو —— اور آج تک کسی قوم نے ایسے غدّار پیدا نہیں کیے جنھوں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر قوم کو یہ سمجھانے کی جسارت کی ہو کہ تمھیں اپنی بقا کے لیے آزاد وطن کی ضرورت نہیں۔ رائے عامّہ کتنی کمزور کیوں نہ ہو، ملّت فروشوں کو پہلوانوں کی حیثیت سے اپنے سیاسی اکھاڑے میں کودنے کی اجازت نہیں دیتی —— وہ قوم کی آنکھوں کے سامنے زہر کا پیالہ بھر کر یہ نہیں کہتے کہ میں دشمن کی طرف سے تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ موت کے بعد تمھاری لاش کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ چھپ چھپ کر انتشار کا بیج بوتے ہیں۔

لیکن مسلمانوں میں اجتماعی شعور کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ وہ ملّت فروش جنھیں صبح و شام دشمن کے دستر خوان کی ہڈیاں چوستے دیکھا جاتا تھا، بازاروں میں دندناتے تھے، چوراہوں پر کھڑے ہو کر تقریریں کرتے تھے —— اُن کی جماعتیں تھیں، انجمنیں تھیں، اور وہ علی الاعلان قوم کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ اے قوم! اگر تجھے پاکستان مل گیا تو تیرا ستیاناس ہو جائیگا۔ عزّت، آزادی اور خود مختاری تیرے لیے بھوک، افلاس اور قحط کا پیغام لائے گی، ہندو ناراض ہو جائے گا اور مہاتما گاندھی کی روح کو صدمہ پہنچے گا —— مسلمانو!

www.allurdu.com

یہ کیا بزدلی ہے کہ تم ہندو اکثریت کے اقتدار سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ دنیا کیا کہے گی کہ تم اس قدر تنگ نظر تھے۔

مسلم اکثریت کے شمال مغربی علاقوں میں پنجاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا اور یہی وہ محاذ تھا جہاں کامیابی حاصل کیے بغیر مسلمانوں کے لیے پاکستان کی منزلِ مقصود کی طرف ایک قدم آگے بڑھنا ناممکن تھا۔

بنگال کے حالات امید افزا تھے، وہاں کانگرس جن مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی تھی، وہ اپنا اثر و رسوخ کھو چکے تھے لیکن پنجاب میں ہندو فسطائیوں کو اپنی بندوقوں کے لیے یونینسٹوں کے کندھے کا سہارا مل چکا تھا۔ کانگرس یہ سمجھ چکی تھی کہ مسلم عوام اُن کے پرانے نمک خواروں یعنی نیشنلسٹ مسلمانوں کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ اس لیے پنجاب میں مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے انھوں نے یونینسٹوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور اپنے تمام ذرائع ان کی کامیابی کے لیے وقف کر دیے۔ یہ لوگ انتخاب کی جنگ لڑنے کے لیے انگریز پرست حکام کی مدد سے لاکھوں روپیہ جمع کر چکے تھے اور اب کانگرسی مہاجنوں کی سرپرستی کے باعث اُن کی پونجی بہت زیادہ ہو چکی تھی۔

ان حالات میں مسلمان نوجوان اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اجتماعی خطرات کے سامنے آنکھیں بند کر کے نہ بیٹھ سکا۔ وہ اپنی درس گاہیں اسکول اور کالج چھوڑ کر ٹرے اور لنگوٹی کے اس ناپاک اتحاد کو شکست دینے کے لیے میدان میں آ گیا پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی نسبت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا جوش و خروش کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو کی اسلام دشمنی ان پر زیادہ واضح تھی، اس لیے ان صوبوں کے سینکڑوں طلبا

جن کی بیشتر تعداد علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی تھی، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔

ضلع گورداسپور کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقامی مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک ریٹائرڈ سکول ماسٹر صدارت کی کرسی پر رونق افروز تھا اور ایک نوجوان تقریر کر رہا تھا۔ اس جلسے کے انعقاد سے قبل شہر اور ارد گرد کے دیہات میں منادی کی گئی تھی کہ ایک پیر صاحب کے صاحبزادے اس جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور چند مشہور لیڈر تقریریں کریں گے۔ دیہات کے لوگ کچھ بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھنے اور کچھ پیر صاحب کے صاحبزادے سے عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے شہر میں جمع ہو چکے تھے۔ جلسے کا وقت ہو چکا تھا کہ صاحبزادے کا پیغام پہنچ گیا کہ انھیں راستے میں روک لیا گیا ہے اور وہ اگلے دن پہنچ سکیں گے۔ مقررین کے متعلق کوئی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں۔

مقامی ذیلدار اور تھانیدار اس جلسے کے مخالف تھے۔ تحصیلدار صاحب دو دن قبل اس شہر کے ارد گرد کے دیہات کے معتبرین کو بلا کر خبردار کر چکے تھے کہ حکام بالا کو علاقے میں بدامنی کا اندیشہ ہے، اس لیے لوگوں کو جلسے میں شریک ہونے سے روکا جائے۔ تھانیدار صاحب شہر کے دو کاندار کو دھمکی دے چکے تھے کہ اگر اس نے مسلم لیگ کے جلسے کے لیے لاؤڈ سپیکر دیا تو اچھا نہ ہوگا۔ ذیلدار صاحب بھی نمبرداروں کی ٹولی کے ساتھ دیہات کا چکر لگا چکے تھے۔ گرائے کے چند مولوی علاقے میں سب سے بڑے مہاجن کی موٹر کار پر بیٹھ کر سادہ دل دیہاتیوں

کو یہ بتا چکے تھے کہ پاکستان کا نعرہ اُن کے لیے بہت خطرناک ہے لیکن اس گاؤں کے چند لڑکے امرتسر اور لاہور کے کالجوں میں پڑھتے تھے اور مقامی اسکول کے طالب علموں کی ایک بھاری تعداد اُن کے زیر اثر تھی۔ چنانچہ وہ اُن کے منظم گروہ کے ساتھ قرب وجوار کی بستیوں میں اس جلسے کی منادی کر چکے تھے۔

جلسہ شام کے چار بجے ہونا تھا اور دیہات کے طالب علم دوپہر سے پہلے ہی اپنے اپنے گاؤں کے لوگوں کے گروہ لے کر شہر پہنچ رہے تھے۔ طالبعلموں کے ہاتھوں میں سبز جھنڈیاں تھیں اور ہر ٹولی کے آگے ایک شخص ڈھول بجاتا آ رہا تھا ــــ یونینسٹ امیدوار نے ڈسٹرکٹ کانگرس کے صدر کو یہ اطلاع بھیج دی تھی کہ یہاں ایک عدد ہوشیار مولوی کی اشد ضرورت ہے۔

پیر صاحب کے صاحبزادے کا پیغام ملنے کے بعد منتظمین جلسہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ اب صدارت کون کرے گا؟ ایک ضعیف العمر ریٹائرڈ اسکول ماسٹر ذیلدار، تھانیدار اور حکّام بالا کے عتاب سے بے پرواہ ہو کر کرسئ صدارت پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گیا تو لیڈروں کا انتظار ہونے لگا ــــ ساڑھے چار بج گئے۔ حاضرین میں اضطراب پیدا ہونے لگا۔ بالآخر کالج کے ایک نوجوان نے تقریر شروع کر دی ــــ وہ پاکستان کے حق میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن جو لوگ دور سے چل کر آئے تھے، بُوڑھے اور نحیف ولاغر سکول ماسٹر کو پیر جی کے صاحبزادے اور اس نوعمر لڑکے کو کسی بڑے لیڈر کا نعم البدل سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُس کی تقریر کا اثر اسٹیج کے اردگرد بیٹھنے والے آدمیوں تک محدود تھا ــ اور جو ذرا دُور تھے، وہ بے پروائی

سے آپس میں باتیں کر رہے تھے ــــ اچانک اس جلسہ گاہ سے کوئی سو قدم دُور سڑک پر دو نئی خوب صورت کاریں اور اُن کے پیچھے ایک لاری آ کر رُکی جس پر لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا ــــ یونینسٹ امیدوار کار سے اترا۔ اُس کے ساتھ ایک کانگرسی مولوی اور اس علاقے کے تین بااثر زمیندار بھی کار سے اترے، دوسری کار سے علاقے کا ذیلدار، سفید پوش اور تین نمبردار نمودار ہوئے تھانیدار اور کریم بخش حوالدار نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ یونینسٹ امیدوار کے اشارے سے پروپیگنڈا کی لاری کے لاؤڈ سپیکر پر گراموفون ریکارڈ لگا دیا گیا اور مسلم لیگ کی جلسہ گاہ سے پچھلی صفوں کے لوگ آہستہ آہستہ اُٹھ کر سڑک پر جمع ہونے لگے۔ کانگرسی مولوی صاحب لاری کی چھت پر کھڑے ہو گئے اور مائیکروفون ہاتھ میں لے کر قرآن کی تلاوت کے بعد تقریر شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں مسلم لیگ کے جلسہ کی رونق آدھی سے کم رہ گئی۔

مسلم لیگ کے مقابلہ میں یونینسٹ اُمیدوار کی اس ہنگامہ آرائی کو تقویت دینے کے لیے بازار اور آس پاس کی گلیوں کے ہندو اور سکھ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ مسلم لیگ کے جلسے میں تقریر کرنے والے نوجوان نے جب یہ صورت حال دیکھی تو نعرے لگانے سروع کر دیے " مسلم لیگ زندہ باد! پاکستان زندہ باد!"

اس کے جواب میں موٹر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے والے مولوی صاحب نے بلند آواز میں کہا۔" نعرۂ تکبیر!" اور اس کے جواب میں بیک وقت دو مختلف آوازیں بلند ہوئیں۔ مسلمان "اللہ اکبر" کہہ رہے تھے لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے بدحواسی کے عالم میں " زندہ باد" کہہ دیا۔ مسلمان ہنس پڑے، وہ ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے۔" دیکھو بھئی! جب مولوی صاحب نعرہ لگائیں تو اللہ اکبر کہنا چاہیے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے بلند آواز میں کہا۔

www.allurdu.com

"ہندو مسلم اتحاد"۔ تو سکھوں اور ہندوؤں نے "زندہ باد" کہہ کر پہلی غلطی کی تلافی کر دی۔

اچانک سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی جس پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سلیم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے چار اور نوجوان بھی تھے۔ سلیم کے اشارے سے ڈرائیور نے جیپ مسلم لیگ کے اسٹیج کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ گاؤں کے وہ لوگ جو ابھی تک دل پر جبر کر کے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، اُٹھ اُٹھ کر جیپ سے اُترنے والے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی یہ کہہ رہا تھا۔ "لیڈر آ گئے" کوئی کہہ رہا تھا۔ "نہیں یار! یہ لیڈر نہیں۔ لیڈر ان کے پیچھے آ رہے ہوں گے۔"

سلیم اور اس کے ساتھی جیپ سے اُترے۔ اُن میں دو علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور اُن کی سیاہ اچکن اور تنگ پاجامے دیکھ کر بعض لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ یہی لیڈر ہیں۔ نوجوان مقرّر نے اسٹیج سے اتر کر سلیم اور اُس کے ساتھیوں سے مصافحہ کیا۔ اُس سے چند سوالات پوچھنے کے بعد سلیم صورتِ حالات کا جائزہ لے چکا تھا۔ اُس نے جلسے کے منتظمین کو تسلّی دے کر کہا۔ "آپ فکر نہ کیجیے، ہمارے پاس لاؤڈ سپیکر موجود ہے، آپ اُسے جیپ سے نکلوا کر اسٹیج پر لگوا دیجیے۔"

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "بھئی ناصر علی! یہ وہی مولوی ہے، جسے ہم نے پرسوں امرتسر میں بھگایا تھا۔"

"ارے یہ کمبخت یہاں بھی پہنچ گیا۔" کالی اچکن والے ایک نوجوان نے حیران ہو کر کہا۔ "یار، بڑا ڈھیٹ ہے یہ۔"

لاؤڈ سپیکر فٹ ہو گیا تو سلیم نے کہا۔ "ناصر علی صاحب! ذرا نعت پڑھ دیجیے۔"

ناصر علی نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر نعت شروع کی اور سامنے تقریر کرنے والے مولوی کی آواز اُس کی بلند اور دلکش تانوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ مسلمان جو تھوڑی دیر قبل جلسے سے اُٹھ کر سڑک پر جمع ہو گئے تھے، اب واپس آ رہے تھے۔

نعت ختم ہوئی تو سلیم مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ تھانے دار اور کریم بخش حوالدار وہاں آ دھمکے۔ تھانیدار نے اسٹیج کے قریب آ کر کہا۔ "شہر میں فساد کا خطرہ ہے، اس لیے آپ یہاں جلسہ نہ کریں!"

سلیم نے جواب دیا۔ "اچھا صاحب! لیکن وہ سامنے سڑک پر کیا ہو رہا ہے؟"

تھانیدار نے جواب دیا۔ "اُدھر مولوی صاحب تقریر کر رہے ہیں۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ میں یہاں پٹاخے چلانے آیا ہوں؟"

لوگوں نے قہقہہ لگایا اور تھانیدار نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"آپ نے ان مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے کہ وہ کون ہیں؟"

"تمھیں اس سے کیا واسطہ؟ تم میری بات کا جواب دو!"

"سردار جی! آپ پاکستان کے متعلق کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟"

تھانیدار نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ "دیکھو جی! میں یہاں دو جلسوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمھارے درمیان اتنا فاصلہ ضرور چاہیے کہ ایک کی آواز دوسرا نہ سُن سکے۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے سردار صاحب! انھوں نے خواہ مخواہ اس جلسے میں خلل ڈالنے کے لیے لاری لا کر یہاں کھڑی کر دی ہے۔ انھوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا

www.allurdu.com

کہ آپ یہاں ڈیوٹی پر کھڑے ہیں۔ یہ یونینسٹ بہت شریر ہیں۔ یہ فساد کا بیج بوتے ہیں اور بدنام ہو جاتے ہیں آپ جیسے افسر۔ آپ انھیں کہیں کہ موٹر یہاں سے ہٹا لیں اور اگر پٹرول نہ ہونے کی وجہ سے موٹر یہاں رُک گئی ہے تو سپاہیوں کو کہیں کہ اُسے دھکیل کر ذرا دُور لے جائیں۔"

کریم بخش حوالدار نے تلخ ہو کر کہا۔ "دیکھو! اگر تم نے تقریر کی تو ہم لاٹھی چارج کر دیں گے۔"

سلیم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کیسے بدتمیز ہو تم! میں تمھارے افسر سے بات کر رہا ہوں اور تم خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ تمھیں یہ بھی خبر نہیں کہ جب تھانیدار کسی کے ساتھ بات کر رہا ہو تو حوالدار کو خاموش رہنا چاہیے!"

تھانیدار پہلے ہی اس اُلجھن سے باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ وہ حوالدار پر برس پڑا۔ "تم کون ہو بیچ میں بولنے والے اور لاٹھی چارج کرنے کے لیے کس اُلّو کے پٹھے نے کہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد سلیم تقریر کر رہا تھا۔ تھانیدار نہ ادھر تھا نہ ادھر، بلکہ درمیان میں کھڑا اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

گزشتہ تین ہفتوں میں امرتسر اور گورداسپور کے اضلاع کا دورہ کرنے کے بعد سلیم یہ سمجھ چکا تھا کہ شہروں کے باشندوں کو پاکستان کا حامی بنانے کے لیے اب تقریروں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ شہروں کے تاجر، مزدور اور ملازم پیشہ مسلمان ہندو ذہنیت کو خوب سمجھتے ہیں اور کانگرس یونینسٹ مسلمانوں کے کندھے پر اپنی بندوق رکھ کر انھیں فریب نہیں دے سکتی۔ شہروں کے تعلیم یافتہ بچے اور بوڑھے طرّے اور لنگوٹی کے ناپاک اتحاد کے خلاف میدان میں آ چکے تھے لیکن دیہات میں تعلیم یافتہ لوگ بہت کم تھے اور ان میں سے اکثر گھروں سے باہر سرکاری دفاتر میں کام کرتے تھے اور وہ چھوٹے یا بڑے تعلیم یافتہ زمیندار جو ملازم نہیں تھے، تھانیداروں، تحصیلداروں، ذیلداروں اور پولیس کے سپاہیوں، آنریری مجسٹریٹوں اور جھوٹی گواہیاں

دینے والے معتبروں سے بہت مرعوب تھے۔ تاہم سلیم یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں سے بھی ستّر یا اسّی فیصدی ایسے ہیں جو بظاہر ابن الوقت یونینسٹوں کے ساتھ ہیں، لیکن وقت آنے پر پاکستان کو ووٹ دیں گے۔ اگر وقت سے پہلے انھیں یہ پتہ چل گیا کہ اس انتخاب کے بعد پانچ دریاؤں کی سرزمین سے طرّے کا اقتدار ختم ہونے والا ہے، تو وہ علی الاعلان پاکستان کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان میں آ جائیں گے۔ سب سے اہم مسئلہ دیہات کے اَن پڑھ عوام کا تھا جن کے ووٹوں کی قیمت چکانے کے لیے زمیندار لیگ کے چندے میں سود در سود لینے اور بلیک مارکیٹ کرنے والے مہاشوں کا فالتو روپیہ بھی شامل ہو چکا تھا۔ دیہات کے لوگ اُن معتبروں کو جو پانچ رُوپے کے عوض جھوٹی گواہی دینے کے لیے دس دس میل پیدل جایا کرتے تھے، اب خوبصورت کاروں پر یونینسٹ امیدواروں کے حق میں نعرے لگاتے دیکھ رہے تھے، وہ دیہاتیوں کے ساتھ اس قسم کی عام فہم باتیں کیا کرتے تھے:۔

"تمھیں مٹی کے تیل کی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں!"

"اور تمھیں کھانڈ بھی نہیں ملتی؟"

"جی! وہ بھی نہیں ملتی۔"

"تمھیں کپڑے کی بھی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں! اب تو مُردوں کے لیے کفن بھی نہیں ملتے۔"

"یونینسٹ امیدواروں کو ووٹ دو۔ تمھیں مٹی کا تیل بھی ملے گا، کھانڈ بھی ملے گی اور مُردوں کے لیے کفن بھی ملیں گے۔ کفن مفت ملیں گے۔"

"جی مُفت؟"

www.allurdu.com

"ہاں! بالکل مفت۔ یونینسٹ پارٹی زمینداروں اور کسانوں کی پارٹی ہے، تمھارے لیے ہر گاؤں میں اسکول اور ہسپتال کھولے جائیں گے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام ہوگا۔ لگان بالکل کم کر دیا جائے گا ——— ہاں کفن کی اگر کسی کو ضرورت ہو تو اب بھی مفت مل سکتا ہے۔ امیدوار خود تقسیم کرتا ہے۔"

گاؤں کے بچے خوب صورت کار کے گرد جمع ہو جاتے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ موٹر والوں کو بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ موٹر کے ساتھ بے تکلّف ہو جاتے، کوئی ہارن بجاتا۔ کوئی مڈگارڈ پر بیٹھ کر گنّا چوستا۔ بزرگ انھیں ڈانٹتے لیکن کار والے کہتے "بھئی! بچّوں کو کچھ نہ کہو، ڈرائیور! ذرا ان کو سیر کرا دو۔ ہاں بھئی! ذرا نعرہ لگاؤ۔ "فلاں چودھری زندہ باد! زمیندار اور کسان زندہ باد!" اور گاؤں کے بچّے اُسے موٹر پر سواری کی فیس سمجھ کر نعرے لگا دیتے۔

سلیم اس اجتماع میں اُن لوگوں کی بڑی تعداد دیکھ رہا تھا جو اس قسم کے پروپیگنڈے سے مرعوب کیے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کی تقریر اُن تقریروں سے بہت مختلف تھی، جو شہر کے لوگوں کے لیے کی جاتی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

"بھائی! آج میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ میرے سامنے ایک مسلمان مولوی تقریر کر رہا ہے اور مسلمانوں سے زیادہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہیں ——— اور وہ خوشی سے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن سچ بتاؤ کہ تم نے پہلے کبھی یہ تماشا دیکھا ہے کہ ایک مولوی وعظ کر رہا ہو اور ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہوں؟"

سامعین میں سے بعض نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"اچھا بھائی! تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسا خضر صورت مولوی قرآن اور حدیث سُنا رہا ہو، اور ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گلے میں پھولوں

کے ہار ڈال رہے ہوں؟"

"نہیں۔" لوگوں نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی! یہ بتاؤ کہ وہ دو کاریں اور وہ موٹر جس کی چھت پر مولوی صاحب کھڑے تقریر کر رہے ہیں، کس کی ہیں؟"

ایک نوجوان نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "یونینسٹ امیدوار کی۔"

"لیکن بھئی! میں نے تو یہ سُنا ہے کہ اس کے پاس اپنا صرف ایک ٹانگہ تھا اور وہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔ یہ نئی نئی کاریں کہاں سے آ گئیں؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "یہ دونوں کاریں سیٹھ دھنی رام کی ہیں، اور لاری سردار گوپال سنگھ کی ہے۔"

"تو بات یوں ہے کہ سیٹھ دھنی رام نے مسلم لیگ کے مخالف امیدوار کو انتخاب کی جنگ کے لیے اپنی کاریں دی ہیں۔ گوپال سنگھ نے اپنی لاری دی ہے اور لاؤڈ سپیکر بھی شاید کسی سردار صاحب یا سیٹھ صاحب نے دیا ہو۔ ہمیں اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ انھوں نے ضرورت کے وقت ہمارے ایک غریب بھائی کی مدد کی ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب ہندو ساہوکار ایک غریب کسان سے قرضہ وصول کرتا ہے تو اس کے گھر سے دو آنے کا توا بھی قرق کرا لیتا ہے لیکن آج یونینسٹ امیدواروں کو وہ اپنی موٹریں دے رہے ہیں، روپیہ دے رہے ہیں۔ کل تک یہ لوگ کفن کا کپڑا بھی بلیک مارکیٹ میں بیچتے تھے لیکن اب مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کو، سینکڑوں تھان مفت دیے جا رہے ہیں تاکہ وہ تمھیں مفت کفن دے کر ووٹ حاصل کر سکیں۔ ——— میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمارا ہندو بھائی جو سود در سود لے کر ایک آنے کا ایک روپیہ بنانے کا عادی تھا، اس قدر فضول خرچ کیوں ہو گیا ہے؟

www.allurdu.com

اس سوال کا جواب شاید تم نہ دے سکو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ہندو پاکستان کا مخالف ہے یا نہیں؟"

"مخالف ہے۔" سامعین نے جواب دیا۔

"اور وہ چودھری صاحب جو اس کے پیسوں سے مُسلم لیگ کے خلاف انتخاب لڑ رہے ہیں؟"

"وہ بھی مخالف ہیں۔"

"اور سکھ جنھوں نے انھیں اپنی لاری دی ہے؟"

"وہ بھی مخالف ہیں۔"

"اور یہ مولوی صاحب جن کی تقریر سُن کر ہندو اور سکھ بھائی خوش ہو رہے ہیں؟"

"یہ بھی مخالف ہیں۔"

"اور وہ تھانیدار صاحب جو ابھی مجھ پر ناراض ہو رہے تھے؟"

"وہ بھی مخالف ہیں۔"

"لیکن کیوں؟"

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے سلیم نے قدرے تامّل کے بعد کہا:

"بھئی! پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان زیادہ ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ تمھیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"لیکن ہندو کو اعتراض ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور اگر چند دن کے لیے پاکستان کی مخالفت کرنے

والے مسلمان امیدواروں کو وہ اپنی موٹریں، کھانڈ کی بوریاں اور کفن کے لیے کپڑا دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنا سکتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں۔ اُس کا ساہوکارہ ہوگا، اُسی کا قانون ہوگا، اُسی کی عدالتیں ہوں گی۔ وہ آج اگر ایک روپیہ خرچ کر رہا ہے، تو اس امید پر کہ کل وہ ایک لاکھ وصول کر سکے گا ــــ اگر وہ پانچ سو یا ایک ہزار آدمیوں کو مفت کفن دے کر دس کروڑ مسلمانوں کو ذلّت، افلاس اور غلامی کے قبرستان کی طرف دھکیل سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔"

کانگرسی مولوی اس سے پہلے بھی اس قسم کی تقریر سُن چکا تھا۔ سلیم کے ساتھ امرتسر کے ایک قصبے میں اس کی مٹھ بھیڑ ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس سیدھی سادی راگنی کی جو تان اُس پر ٹوٹنے والی ہے، وہ خطرناک ہے۔ وہ تقریر کرتے کرتے رُک جاتا اور سمتِ مخالف سے چند الفاظ سننے کے بعد پھر کوئی بات شروع کر دیتا لیکن اُس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔

سلیم کہہ رہا تھا: ــــ "کانگرسی ہندو یا سکھ پاکستان کے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ سارے ہندوستان پر ہندو کا راج چاہتے ہیں۔ یہ یونینسٹ مسلمانوں کا گروہ اس لیے پاکستان کے مخالف ہے کہ اُنھوں نے انگریز کے بعد ہندو کو اپنا مائی باپ بنا لیا ہے لیکن تم حیران ہو گے کہ وہ خضر صورت مولوی صاحب جن کے سر پر ہندو کی سی چوٹی ہے، نہ سکھوں کے سے بال اور نہ یونینسٹوں کا ساطرّہ، انھیں پاکستان کی مخالفت سے کیا ملتا ہے؟"

سلیم کے ایک ساتھی نے اُٹھ کر جواب دیا۔ "دال روٹی اور کیا!"

اب لوگ مولوی صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ سلیم نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بھئی! دال روٹی کے لیے کوئی

www.allurdu.com

شخص اتنا بدنام ہونا گوارا نہیں کرتا۔ یہ مرغ اور حلوے کی ڈکاریں ہیں ___ لیکن مولوی صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہندو بھائی حلوہ اور پلاؤ کھلا کر اُن سے کیا کام لے رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ شکاری کانٹے کے ساتھ مچھلی کیسے پکڑتا ہے؟ وہ ڈوری کے ساتھ کانٹا باندھتا ہے! پھر ایک کیڑا پکڑتا ہے جسے کیچوا کہتے ہیں اور اُسے کانٹے کے ساتھ لگا کر پانی میں پھینک دیتا ہے۔ مچھلی سمجھتی ہے کہ یہ اس کی غذا ہے۔ وہ منہ کھول کر اُس کی طرف دوڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کانٹا اس کے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ بھائی! تم مچھلیاں ہو، ہندو شکاری ہے، یونینسٹ اُمیدوار کانٹا ہے اور یہ مولوی کیچوا ہے۔ اس کی شکل سے دھوکا نہ کھاؤ! یہ بڑا خطرناک ہے۔ ہندو شکاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکل و صورت مسلمانوں کو دھوکا دے سکتی ہے۔"

اب کانگرسی مقرّر ایک ہدف تھا اور سلیم کے ترکش کے تمام تیروں کا رُخ اس کی طرف تھا۔ جب وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوتا تو سکول کے لڑکے یہ کہنا شروع کر دیتے۔ "مولوی کیچوا ___ مولوی کیچوا ___ مولوی کیچوا ہائے ہائے!" بعض لڑکے اب جلسے سے اُٹھ کر ایک دکان کی چھت پر جا چڑھے اور اُن کے نعرے موٹر کے گرد کھڑے ہونے والے لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

مولوی صاحب ایک حسّاس طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے، لیکن کانگرس کے تمام انعامات کے عوض انھیں اس نئے لقب سے سرفراز ہونا گوارا نہ تھا۔ اب بچّوں کی آوازوں کے ساتھ دیہاتیوں کے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔ یہ نئی صورتِ حال اور بھی زیادہ المناک تھی اور پھر جب چھت پر بیٹھے ہوئے بچّوں نے ایک ساتھ "مولوی کیچوا ہائے ہائے" کہنا شروع

کیا اور بعض ہندو سکھ بھی ہنس پڑے تو ان کی قوتِ برداشت ختم ہو گئی اور وہ "قائدِ اعظم" کو بُرا بھلا کہنے کے بعد نیچے اُتر آئے۔

جب اُن کی موٹر روانہ ہو رہی تھی تو لڑکے آگے بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہے تھے۔ انھوں نے ایک لڑکے کو تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن غصّے کی حالت میں وہ موٹر کی کھڑکی کا شیشہ نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ اُن کا ہاتھ جس تیزی کے ساتھ اٹھا تھا اُس سے زیادہ پھُرتی کے ساتھ واپس آیا۔ وہ تلملا کر ہاتھ جھٹک رہے تھے کہ ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا ذیلدار بلبلا اُٹھا۔ "ارے ظالم! مار ڈالا۔"

اگلی سیٹ سے یونینسٹ امیدوار نے مڑ کر دیکھا۔ ذیلدار صاحب کا ہاتھ ان کی دائیں آنکھ پر تھا۔ "کیا ہوا چودھری صاحب؟" اس نے سوال کیا۔

"مولوی نے میری آنکھ میں انگوٹھا ٹھونس دیا ہے۔ توبہ میری! ان کے ناخن ہیں یا نشتر؟"

مولوی صاحب کو کار سے باہر کیچوا کہا جا رہا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب اُن کے ناخنوں کی تعریف ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگے:

"لاحول ولا قوۃ، دیکھو جی! میرے ناخن بڑے ہیں یا ذیلدار کے؟"

ذیلدار نے اپنی پگڑی کا پلّو گول مول کر کے اپنی آنکھ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کے ناخن بڑے نہیں، ورنہ آپ نے میری آنکھ نکالنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خدا کی قسم آپ تھوڑا سا زور اور لگا دیتے تو معاملہ ختم تھا۔"

رات کے وقت سلیم اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے ایک ٹھیکیدار کے ہاں قیام کیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اگلے دن کا پروگرام تیار کر رہے تھے کہ

www.allurdu.com

شہر کے چند معززین آ گئے۔ اُن کے ساتھ وہ بوڑھا سکول ماسٹر بھی تھا جس نے شام کے جلسے کی صدارت کی تھی۔ اُس نے سلیم اور اُس کے ساتھیوں سے ان لوگوں کو متعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”بھئی آج آپ لوگ آ گئے‘ خدا نے ہماری عزّت رکھ لی‘ ورنہ حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ آپ لوگ بہت کام کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ جیسے نوجوان بیدار ہو گئے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ علی گڑھ سے بھی کافی طلبا یہاں پہنچے ہیں؟“

سلیم نے کہا۔ ”جی ہاں! یہ مسٹر ناصر علی اور مسٹر ظفر، علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں ناصر صاحب صوبہ بہار کے رہنے والے ہیں اور ظفر صاحب کا وطن یو پی ہے اور یہ مسٹر عزیز اور جعفر لاہور سے آئے ہیں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”خدا تمھیں ہمّت دے!“

اس کے بعد اہلِ مجلس کی توجّہ ناصر علی اور ظفر کی طرف مبذول ہو گئی۔ کسی نے سوال کیا۔ ”آپ کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کی کامیابی یقینی ہے نا؟“

ناصر نے جواب دیا۔ ”جی ہاں! وہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہاں کے مسلمان ہندوؤں کے ستائے ہوئے ہیں۔ وہاں کانگرس کے ایجنٹ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے ــــ سندھ، پنجاب اور صوبۂ سرحد میں عوام کو اس لیے پاکستان کی ضرورت کا احساس نہیں کہ ہندو یہاں انھیں بے ضرر نظر آتا ہے۔ اگر ایک پنجابی یا پٹھان کو یہ کہا جائے کہ ہندو بڑا وحشی اور ظالم ہے تو وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا کیونکہ وہ یہاں اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔ بالخصوص سرحد کے پٹھان سے اگر ہم ایسی بات کریں تو وہ ہمارا مذاق اڑائے گا۔ اُس کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ بد سلوکی کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوبۂ سرحد میں پاکستان کا نعرہ ابھی تک

زیادہ مقبول نہیں ہُوا ــــ یُو پی، بہار اور اقلیّت کے دوسرے صوبوں میں ہمارا بچّہ بچّہ پاکستان پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ وہاں یہ حالت ہے کہ ہندو حلوائی کی کڑاہی اگر کتّا چاٹ رہا ہو تو وہ اُسے دھتکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن اگر سودا لیتے وقت مسلمان کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھُو جائے تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔“

ایک نوجوان نے کہا۔ ”یہ تو آپ نے ٹھیک کہا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور بنگال کے صوبوں کی مسلم اکثرّیت کو تو یقیناً فائدہ پہنچے گا، کیونکہ وہ آزاد ہوں گے اور اُن کی اپنی حکومت ہو گی۔ اُن کے لیے فلاح و ترقی کی راہیں کھُل جائیں گی۔ لیکن آپ لوگوں کو جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں۔ اس سے کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کے ایثار کی میرے دل میں کوئی قدر نہیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے بعد اگر ہندو نے آپ سے انتقام لیا تو آپ کی بے بسی بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟“

حاضرینِ مجلس اس سوال سے بہت برہم تھے لیکن ناصر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ پاکستان کی حمایت میں ہمارے نعرے محض سطحی جذبات کی پیداوار ہیں اور ہم نے اپنے مستقبل کے متعلق نہیں سوچا۔ لیکن ہم کسی اور رنگ میں سوچتے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو کی غلامی قبول کریں دوسرا یہ کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت کے علاقوں میں آزاد اور خود مختار ہو جائیں۔ پہلی صورت میں ہم سب ہندو کے

www.allurdu.com

رحم و کرم پر ہوں گے۔ درۂ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک رام راج کا جھنڈا لہرائے گا۔ ہم سب استبداد کی ایک ہی چکی میں پس رہے ہوں گے اور ہم سب کا مستقبل یکساں تاریک ہوگا۔ دوسری صورت میں کم از کم مسلم اکثریّت کے صوبے ہندو کی غلامی سے بچ جائیں گے اور ہم یہ کہہ سکیں گے کہ پاکستان ہمارے آزاد بھائیوں کا وطن ہے۔ بیشک ہندو کا سلوک ہمارے ساتھ بہجد سفّاکانہ ہوگا لیکن ہم اس امید پر جی سکیں گے کہ ہمارے بھائیوں کو ایک آزاد وطن مل چکا ہے اور وہ ہمارے حال سے بے پروا نہیں۔ اگر راجہ داہر کے قیدخانے سے ایک مسلمان لڑکی کی فریاد نے دمشق کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا تھا تو آپ تین چار کروڑ مسلمانوں کی فریاد سُن کر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونس لیں گے۔ اگر قوم کی مائیں بانجھ نہیں ہوگئیں تو کوئی محمد بن قاسمؒ اور کوئی محمود غزنویؒ ضرور پیدا ہوگا۔ پاکستان کی سرزمین سے کوئی مردِ مجاہد ہماری فریاد سُن کر ضرور تڑپ اُٹھے گا۔ بیشک ایک عبوری دور کے لیے ہمارے گرد تاریکیوں کا ہجوم ہوگا لیکن ہمارے دلوں میں امید کے چراغ جگمگاتے رہیں گے۔ ہم اپنے ظلمت کدوں میں بیٹھ کر پاکستان کی خاک سے نمودار ہونے والے سورج کا انتظار کریں گے اور فرض کیجیے پاکستان میں ہمارے آزاد بھائی ہمیں بھول بھی جائیں یا ہماری فریاد انھیں متاثر نہ کر سکے تو بھی ہم اسے خسارے کا سودا نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں مرنے کے بعد بھی یہ تسکین ضرور حاصل ہوگی کہ جن سفّاک ہاتھوں نے ہمارا گلا گھونٹا ہے، وہ ہمارے بھائیوں کی شاہ رگ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اگر عزت اور آزادی کی زندگی میں اُن کے ساتھی نہ بن سکے تو یہ ہمارے مقدّر کی بات ہے لیکن ہم یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ذلّت اور غلامی کی موت میں آپ بھی ہمارے ساتھی بن جائیں۔ اگر ہم آپ کے ساتھ تیر کر ساحل تک نہیں جا سکتے

تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ڈوب جائیں۔"

ناصر کی آواز بیٹھ چکی تھی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

———— ✳ ————

صوبہ سرحد کے سوا مسلم لیگ ہر صوبے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ پنجاب میں یونینسٹوں کا سفینہ انتخابات کے بھنور کی نذر ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلہ میں انھوں نے بہت بڑی شکست کھائی تھی۔ جہاں لیگ کے اسّی امیدوار کامیاب ہوئے تھے، وہاں ابن الوقتوں کی تعداد فقط نو تھی لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے یونینسٹ اقتدار کے گرتے ہوئے محل کو سہارا دیا۔ انگریز گورنر نے اُن کی سرپرستی فرمائی اور مسلم لیگ کو جو صوبے کی سب سے بڑی پارٹی تھی، نظرانداز کر کے خضر حیات کو وزارت کی تشکیل کا موقع دیا۔ چند ملّت فروشوں کے باعث پنجاب کے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبہ میں اقلیتوں کے محکوم ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ ایک ہندو یا سکھ کو بھی اپنے ساتھ نہ ملا سکی، کیونکہ پنجاب میں لیگی وزارت کے قیام سے انھیں پاکستان کے محاذ کو تقویّت پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن کانگرس کو پاکستان کے خلاف سامراجی مقاصد کی توپ کھینچنے کے لیے وہ آزمودہ کار خچّر مل چکے تھے۔ جنھیں انگریز نے اپنے سیاسی اصطبل میں بڑے شوق اور محنت سے پالا تھا۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کی وزارت بن چکی تھی۔ سندھ میں بھی ابن الوقت مسلمانوں کا ایک ٹولا وزارت کا توبرا دیکھ کر کانگرس کے اقتدار کی رتھ کھینچنے کے لیے تیار تھا لیکن مسلم لیگ وزارت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کی اکثریت اس قدر نمایاں تھی کہ کانگرس کو جوڑ توڑ کا موقع نہ ملا۔

www.allurdu.com

بہرحال کانگرس اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں پر اُس کا تسلط تھا اور وہاں ہندو عوام کو پاکستان کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے منظم کیا جا رہا تھا۔ کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی میں ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی افواج کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھیں۔ ہندو مہاجن انھیں روپیہ دے رہے تھے اور ہندو ریاستوں سے ان کے پاس اسلحہ اور بارود پہنچ رہا تھا —— مدافعانہ جنگ کے لیے پنجاب اور سرحد مسلمانوں کے اہم ترین مورچے تھے لیکن یہاں بھی سکھوں کے گوردوارے اسلحہ سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ہندوؤں کے مندروں اور اسکولوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی فوجیں تیار ہو رہی تھیں لیکن شاہ پور کا وہ سیاست دان جس نے اپنی قوم کی بقا اور آزادی کے عوض وزارت کا سودا کیا تھا، خاموش تھا۔ پنجاب کا مورچہ مضبوط بنانے کے لیے ہندو اور سکھ صوبہ سرحد سے اسلحہ بھیج رہے تھے لیکن عدم تشدد کے دیوتا کے سرحدی چیلے اس صورتِ حالات سے قطعاً پریشان نہ تھے۔

ہندوستان کے سیاسی اکھاڑے میں کانگرس کی جد و جہد بظاہر آئینی تھی لیکن درپردہ وہ اپنے جارحانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے تیاریاں کر رہی تھی۔ مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اس صورتِ حالات سے بے خبر نہ تھا لیکن پنجاب اور سرحد میں ان کے دفاعی مورچوں پر چند افراد کی ملت فروشی، یا کوتاہ اندیشی کے باعث دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔

برطانیہ کا وزارتی مشن اپنی تجاویز لے کر آیا۔ ان تجاویز میں نہ وہ اکھنڈ ہندوستان تھا جو کانگرس چاہتی تھی اور نہ وہ پاکستان تھا جس کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا۔ گروپ بندی کی صورت میں مسلمانوں کے تحفظ کے تھوڑے بہت امکانات

دیکھ کر مسلم لیگ اپنے اصل مطالبہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو گئی لیکن کانگرس کو مرکز کے اختیارات کا محدود ہو جانا گوارا نہ تھا۔ اُس کے فسطائی مقاصد کی تکمیل کے لیے مرکز میں ہندو اکثریت کے اختیارات کا لامحدود ہونا ضروری تھا۔ گروپ بندی میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو جو معمولی خود اختیاری ملتی تھی، اس میں کانگرس کے سیاسی مہاتما کو اپنی مہاسبھائی خوردبین کی بدولت پاکستان کے خطرناک جراثیم نظر آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ اس تجویز کے بانیوں کو اپنے مخصوص انداز میں یہ سمجھا رہے تھے کہ تمھارا مطلب یقیناً وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ عبوری دور کی حکومت کے لیے بھی کانگرس مسلم لیگ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مانگتی تھی۔ چنانچہ مرکزی کابینہ کی تشکیل کے لیے وائسرائے نے پانچ کانگرس پانچ مسلم لیگ اور دو اقلیتوں کی نسبت کو چھ، پانچ اور دو کی نسبت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد کانگرس لمبے عرصہ کے لیے وزارتی مشن کی تجویز کی لنڈتی زبان کا واردھائی ترجمہ نافذ کرنے پر مصر تھی اور جب تجاویز کے بانیوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا مطلب وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے تو گاندھی کی آتما کو دکھ ہوا۔ تجاویز رد کر دی گئیں۔

وائسرائے لارڈ ویول یہ اعلان کر چکا تھا کہ اگر کوئی پارٹی رضامند نہ ہوئی تو بھی اُس کے تعاون کے بغیر عبوری دور کے لیے مرکزی کابینہ کی تشکیل کی جائے گی —— اعلان کے مطابق اب لیگ کو کابینہ کی تشکیل کا موقع ملنا چاہیے تھا لیکن مسلم لیگ کو جلد یہ معلوم ہو گیا کہ اُس نے انگریز کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں دھوکا کھایا ہے۔[1]

---

[1] اس نئی صورتِ حالات میں سر کرپس نے یہ کہہ کر کانگرس کی مشکل حل کر دی کہ کانگرس نے لمبے عرصے کی تجاویز مان لی ہیں، اس لیے عبوری دور کی حکومت کی تشکیل کی پیشکش واپس لی جاتی ہے۔

www.allurdu.com

دراصل ہندو اور انگریز کے اس تمام ہیر پھیر کا مقصد پاکستان کی چٹان سے مسلم لیگ کے پاؤں متزلزل کرنا تھا۔ اب مسلم لیگ ہوا کا رُخ دیکھ چکی تھی اور چند قدم ڈگمگانے کے بعد اُس کا رُخ پھر اپنی اصلی منزل مقصود یعنی پاکستان کی طرف ہو چکا تھا۔

مسلمان کے میدان سے نکلتے ہی انگریز اور ہندو نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور لارڈ ویول عبوری دور کے لیے کانگرس کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دینے کا تہیّہ کر چکے تھے۔ مسلم لیگ کا آخری حربہ ڈائرکٹ ایکشن تھا جو انگریز کی ہندو نواز پالیسی کے خلاف احتجاج تھا لیکن ہندو اپنے آپ کو انگریز کا جانشین سمجھ کر میدان میں آ چکا تھا۔ بمبئی احمد آباد۔ الٰہ آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں مسلمان اقلیّت میں تھے۔ ہندو نے لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی۔ اس کے بعد کلکتہ کی باری آئی اور یہاں ڈائرکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلوس پر اینٹوں گولیوں اور دستی بموں کی بارش کی گئی۔ ان حالات میں وائسرائے نے آگ پر مزید تیل چھڑکنا ضروری سمجھا اور مرکز میں کانگرس کی وزارت بنا دی —

وہ ہندو جس نے اقتدار حاصل ہو جانے کی اُمید پر اتنا کچھ کیا تھا، اب طاقت کے نشے میں چُور ہو چکا تھا۔ پنڈت نہرو نے وزارتِ عظمٰے کا قلمدان سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ میری وزارت مخالفین کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اپنی ساری قوت صرف کرے گی پٹیل نے بمبئی میں تقریر کی اور وہاں فساد کی سُلگتی ہوئی آگ کے شعلے زیادہ تیز ہو گئے۔

۱

ابھی تک مسلم اکثریت کے کسی شہر یا علاقے میں فساد نہیں ہوا تھا لیکن ہندو نے کلکتہ میں جو آگ لگائی تھی، اُس کے چند شعلے نواکھالی جا پہنچے۔ یہ مسلم اکثریت

کا علاقہ تھا اور کلکتہ کے کچھ پناہ گزین ہندوؤں کے ہاتھوں اپنی لرزہ خیز داستانیں سنانے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے چنانچہ فساد شروع ہو گیا۔ مسلم لیگی وزارت کے عہدہ دار اور لیڈر صورتِ حالات پر قابو پانے کے لیے فوراً وہاں پہنچے — صلح اور امن کے لیے اپیلیں کی گئیں اور صورتِ حالات پر قابو پا لیا گیا۔ مسلم پریس کی اطلاعات کے مطابق قتل ہونے والے ہندوؤں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی اور بعض لیڈر اسے چھ سو[1] تک شمار کرتے تھے۔ اس کے برعکس صرف کلکتہ میں تین ہزار مسلمان قتل کیے جا چکے تھے۔ لیکن ہندو اور مسلمان کے قتل میں بہت فرق تھا۔ مہاتما گاندھی کی وہ آتما جس نے انتہائی صبر و سکون سے بمبئی، الٰہ آباد، احمد آباد، کانپور اور دوسرے شہروں میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا بے چین ہو گئی۔ ہندو پریس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ مہاتما گاندھی دہلی کی بھنگی کالونی سے

---

[1] یہاں تعداد گھٹا کر دکھانا مقصود نہیں۔ مسلم اکثریت کے علاقے میں ہندوؤں کا تھوڑا یا بہت قتل بہرحال افسوس ناک بات تھی۔ اگر اس میں لیگی وزارت یا کسی اور ذمہ دار سیاسی پارٹی کا ہاتھ ہوتا، تو یہ بات اور بھی شرمناک ہوتی لیکن موقع پر پہنچنے والے بنگالی ہندوؤں کے اپنے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں کہ نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں اور وزارت نے اس فساد کو دبانے کی کوشش کی بلکہ مسلمانوں نے اپنے گھروں میں ہندوؤں کو پناہ دی۔ ایسے حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہوگا، کہ یہ مقامی مسلمانوں کی سازش نہ تھی بلکہ ایسا حادثہ تھا جس کے اسباب بمبئی، کلکتہ اور دوسرے شہروں سے فراہم ہو چکے تھے۔

www.allurdu.com

مسلمانوں کی سفّاکی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوا اُٹھا اور نواکھالی پہنچ گیا اور وہاں سے یہ خبریں آتی تھیں کہ آج مہاتما گاندھی نے اتنے میل پیدل سفر کیا ہے۔ آج مہاتما جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور ہندوستان کے طول وعرض میں مہاتما جی کے چیلے ان کے آنسو پونچھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بالآخر وہ آتشیں مادہ پھُوٹ نکلا جو بھارت ماتا کے سینے میں مدّت سے پک رہا تھا۔ عدم تشدّد کے دیوتا کے پجاری بہار کے مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام دے رہے تھے۔ ہندو فسطائیت، وحشت، بربریّت اور سفّاکی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی تھی۔

———✳———

گھر میں مجید کی شادی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ لائل پور سے اس کی بہن امینہ اپنے شوہر کے ساتھ دوپہر کی گاڑی سے آنے والی تھی۔ سلیم اور مجید انھیں لینے کے لیے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ گاڑی آئی۔ امینہ کا خاوند انٹر کلاس کے ڈبے سے اترا۔ ساتھ والے زنانہ ڈبہ کی کھڑکی سے امینہ نے اپنے بُرقعے کا نقاب اٹھا کر باہر جھانکا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اس کی گود سے آٹھ دس ماہ کا بچہ لے لیا۔ امینہ نے ماں بننے کے بعد پہلی بار سلیم کو دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے پر حیا کی سُرخی چھا گئی۔ وہ لجاتی، شرماتی اور سمٹتی ہوئی گاڑی سے اتری۔ نوکر سامان اتار چکا تھا اور مجید اپنے بہنوئی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ سلیم نے پلیٹ فارم پر شیشم کے درخت کے نیچے لکڑی کے بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "امینہ وہاں بیٹھ جاؤ! ذرا بھیڑ کم ہو جائے تو چلتے ہیں۔ امینہ کا خاوند اور مجید بھی وہاں آگئے۔ مجید نے نوکر سے کہا۔ تم جا کر تانگے میں سامان رکھو۔ ہم

ابھی آتے ہیں۔" نوکر چلا گیا۔ امینہ کے خاوند نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "سلیم صاحب! آپ کی بہن آپ سے بہت ناراض ہے۔"

سلیم نے امینہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "کیوں ری چڑیل! مجھ سے خفا ہو؟"

امینہ نے برقعہ کا نقاب اٹھا کر چہرے پر مصنوعی غصّہ لاتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! میں آپ سے بات نہیں کروں گی۔"

"ارے ارے! اتنا غصّہ ٹھیک نہیں۔ بھئی مجید! ہماری صلح کرا دو!"

امینہ نے اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہو کر جھجکتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! آپ تو بھلا فوج میں تھے، اس لیے نہ آسکے لیکن ان سے پوچھئے، یہ لاہور سے لائل پور نہیں پہنچ سکتے تھے؟ پہلے تو یہ امتحانوں کا بہانہ کرتے تھے لیکن اب کون سی مصروفیّت تھی؟"

امینہ کے خاوند نے کہا۔ "ہاں جی پہلے انھوں نے مجھے لکھا کہ ایم۔ اے کا امتحان دینے کے بعد ضرور آؤں گا۔ اس کے بعد لکھا کہ کتاب لکھ رہا ہوں اسے ختم کرنے کے بعد آؤں گا۔ کتاب چھپ کر ہمارے پاس پہنچ گئی لیکن یہ نہ آئے ـــــ امینہ کہتی تھی کہ انھیں شکار کا شوق ہے اور میں ہر روز ان کے لیے بندوقیں صاف کیا کرتا تھا۔"

سلیم نے کہا۔ "بھئی میں ابّا جان کے پاس سیالکوٹ چلا گیا تھا۔ وہاں سے انھوں نے کشمیر جانے کی اجازت دے دی۔ اب میں بالکل فارغ ہوں۔ کسی دن ضرور آؤں گا اور جب تک میری بہن تنگ نہیں آجائے گی، وہیں رہوں گا۔"

ریلوے پلیٹ فارم سے مسافر خانے کی طرف کھُلنے والے گیٹ پر ریلوے

بابو کسی مسافر سے جھگڑ رہا تھا اور چند لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ مجید، سلیم کو امینہ اور اس کے خاوند کے ساتھ باتیں کرتا چھوڑ کر اس طرف چلا گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہی اُس نے ہنستے ہوئے مڑ کر دیکھا اور سلیم کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سلیم تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ "کیا ہے یہاں؟" اس نے سوال کیا۔

مجید نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ارے ادھر دیکھو! چودھری رمضان بابو کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔"

سلیم نے چودھری رمضان کو بابو کے ساتھ گرما گرم بحث کرتے دیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مجید نے اُسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ "ارے ٹھہرو ذرا باتیں سننے دو۔"

بابو کہہ رہا تھا۔ "تم کو ساڑھے تین روپے دینے پڑیں گے۔ میرے ساتھ زیادہ باتیں مت کرو۔"

چودھری رمضان نے جواب دیا۔ "واہ جی اگر تمھیں تین روپے دینے تھے تو میں ٹکٹ کیوں لیتا؟"

"ارے میں ٹکٹ کی بات نہیں کرتا۔ تمھارے سامان کا وزن زیادہ ہے، میں اس کا کرایہ مانگتا ہوں۔"

رمضان نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم! یہ تمام ہانڈیاں دوسروں کی ہیں میں نے اپنے گھر کے لیے صرف ایک خریدی تھی۔"

"مجھے اس سے کیا واسطہ کہ تم نے اپنے لیے ایک ہانڈی خریدی ہے، یا سب خریدی ہیں۔ یہ بوری تمھاری ہے اور اس میں جتنا سامان ہے، میں اس کا کرایہ تم سے وصول کروں گا۔"

"دیکھو بابو جی! میں نے ایک بار آپ سے کہا ہے کہ میں لیسرور کے قریب اپنے رشتہ داروں کو ملنے گیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے کہا کہ لیسرور کی ہانڈیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے ضرور لیتے آنا۔ فجی، سنتی، ہرنام کور، بھاگو تیلن، رحمت بی بی، ریشمے جولاہی اور پڑوس کی کئی عورتیں میرے گرد ہو گئیں۔ وہ مجھے پیسے دینا چاہتی تھیں لیکن میں نے سوچا، گاؤں کی مائیں بہنیں ہیں اگر ایک دو روپے خرچ بھی ہو گئے تو کوئی بات نہیں۔ بابو جی! میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ آپ خود سوچیں، اگر آپ میرے گاؤں کے رہنے والے ہوں۔ اور آپ کی ماں مجھے یہ کہے کہ چودھری رمضان! میرے لیے لیسرور سے ایک ہانڈی لے آنا، تو مجھے انکار کرتے شرم نہ آئے گی؟"

"بس چپ رہو۔" بابو نے گرج کر کہا۔ "کرایہ نکالو!"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ ہانڈیوں کا کرایہ اُن کی قیمت سے تین گنا زیادہ ہوتا ہے؟"

"بس آج تمھیں معلوم ہو گیا نا۔ آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے۔"

"بابو جی! اگر تمھیں خدا نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی توفیق نہیں دی تو دوسروں کو کیوں منع کرتے ہو؟"

"مذاق مت کرو۔ میں ڈیوٹی پر کھڑا ہوں۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ڈبے کے اُوپر کھڑے ہو ورنہ میں نہ لاتا یہ ہانڈیاں۔"

لوگ ہنس رہے تھے اور بابو کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ وہ چلّایا۔ "زبان بند کرو اور پیسے نکالو۔"

رمضان نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا۔ "بابو جی! تم خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہو۔ اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو ہانڈیوں کی بوری یہاں لو، گاؤں

www.allurdu.com

کی عورتیں خود لینے کے لیے آجائیں گی۔ اُن سے دو دو آنے لے لینا۔ تمھاری رقم پوری ہو جائے گی ـــــ ورنہ میرا ٹکٹ مجھے واپس دے دیں۔ یہ ہانڈیاں پسرور چھوڑ آتا ہوں۔"

"تم کسی جنگل سے تو نہیں آئے؟"

"بابوجی! پسرور شہر ہے جنگل نہیں۔"

عمر رسیدہ اسٹیشن ماسٹر یہ تماشا دیکھ کر آگے بڑھا اور اُس نے نرمی سے رمضان کو محکمہ ریلوے کے قواعد و ضوابط سمجھانے کی کوشش کی۔

چودھری رمضان نے فریاد کے لہجے میں کہا۔ "بابو خدا کی قسم! گاڑی میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں سارا راستہ یہ بوری اپنی گود میں رکھ کر لایا ہوں۔ ہانڈیوں کی قیمت میں نے دی، ٹکٹ کے پیسے میں نے دیے تکلیف میں نے اٹھائی، اب آپ ہی بتائیے اگر ساڑھے تین روپے اس بابو کو دے دوں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ یہ ہوگا کہ تم جیل نہیں جاؤ گے اور تمھاری عزت بچ جائے گی۔"

چودھری رمضان کچھ سوچ کر بولا۔ "بابوجی میں نے کوئی چوری کی ہے جو جیل جاؤں گا؟ یہ لو ساڑھے تین روپے اور ایسی تیسی ان ہانڈیوں کی۔" اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساڑھے تین روپے گن کر بابو کو دے دیے۔ پھر جھک کر بوری کھولی اور ایک ہانڈی نکال کر فرش پر مارتے ہوئے بولا۔ "یہ مائی فجی کی۔"

پھر اس نے دُوسری اٹھا کر پھینکی اور کہا۔ "یہ سنتی کی۔" اسی طرح اس نے یکے بعد دیگرے باقی ہانڈیاں توڑتے ہوئے کہا۔ "یہ ہرنام کور کی، یہ بھاگو تیلن کی، یہ رحمت بی بی کی، یہ ریشمے جولاہی کی، یہ جلال کی ماں کی!"

جوں جوں ہانڈیاں کم ہو رہی تھیں اُس کا جوش اور غصّہ زیادہ ہو رہا تھا۔

سلیم، مجید اور دوسرے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چودھری رمضان نے آخری ہانڈی اُٹھائی تو اسے بروقت کسی کا نام یاد نہ آیا۔ اس نے بابو کی طرف غضب ناک ہو کر دیکھا اور "یہ بابو کی ماں کی" کہتے ہوئے زمین پر دے ماری۔

بابو نے اُسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن سلیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

بابو سلیم کو جانتا تھا، وہ بولا۔ "دیکھو جی! یہ گالیاں دیتا ہے۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔"

رمضان بولا۔ "بابوجی! میں نے تم کو کونسی گالی دی ہے۔ گالیاں تو اُن کی سُننے والی ہوں گی جن کی یہ ہانڈیاں تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آج شام بھاگو تیلن کی آواز تمھارے کانوں میں نہیں پہنچے گی ورنہ تم میری باتوں کو گالیاں نہ کہتے۔"

سلیم نے اسٹیشن ماسٹر کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "وہ غریب آدمی ہے لیکن اگر میں اسے پیسے دوں تو وہ نہیں لے گا۔ وہ میرے گاؤں کا ہے آپ اپنی طرف سے اُسے یہ پیسے دے دیں۔" سلیم نے پانچ روپے کا نوٹ اسٹیشن ماسٹر کو دے دیا۔

چودھری رمضان اب از سر نو لوگوں کو اپنی سرگزشت سُنا رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے اُس کے قریب آکر کہا۔ "بھئی چودھری! ناراض ہو کر نہ جاؤ، یہ لو پانچ روپے میں دیتا ہوں لیکن اب دوبارہ پسرور سے ہانڈیوں کی بوری لاؤ تو بک کروا لینا۔"

"نہیں جی اپنے پیسے پاس رکھو، میں باز آیا ایسی نیکی سے۔"

www.allurdu.com

"نہیں بھائی لے لو! ہم تمھیں جرمانہ اور ہانڈیوں کی قیمت واپس کرتے ہیں۔"

چودھری رمضان نے مجید اور سلیم کی طرف دیکھا اور ان کے اشارے سے نوٹ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بعد خالی بوری اپنے کندھے پر رکھ لی۔

مجید نے کہا۔ "چودھری! چلو ہمارے ساتھ تانگے پر چلو۔"

جب وہ تانگے پر سوار ہوئے تو رمضان کہہ رہا تھا۔ "بھئی! دُنیا میں شرافت کی کوئی قدر نہیں۔ وہ بابو جس کا نیولے کی طرح منہ ہے مجھے کہہ رہا تھا کہ میں یہاں ڈپٹی کے اُوپر کھڑا ہوں۔ جب تمھیں اور صوبے دار کو دیکھا تو بڑے بابو نے چپکے سے پانچ رُپے نکال کر دے دیے۔"

مجید کی برات واپس آچکی تھی۔ گھر میں عورتیں دُلھن کے گرد جمع تھیں۔ مجید کی ماں، دادی اور چچیوں کو مبارکباد دی جا رہی تھی۔ ایک مُعمّر عورت نے مجید کی دادی سے پوچھا۔ "تحصیلدار کی ماں! سلیم کی شادی کب کرو گی؟"

"بہن! اگر میرے بس میں ہو تو آج ہی کر دوں لیکن علی اکبر کہتا ہے کہ اگر اُسے کوئی ملازمت نہ ملی تو وکالت کے لیے تین سال اور پڑھنا پڑے گا۔ اس لیے شادی ایک بوجھ ہوگا۔"

"ہے ہے! ساری عُمر پڑھتا ہی رہے گا۔ اس کے ساتھی تین تین بچّوں کے باپ ہو گئے —— اور وہ تین سال اور پڑھے گا۔ کہیں رشتہ تلاش کیا ہے؟"

بہن! بہت رشتے آتے ہیں لیکن سلیم کی ماں کو ایک لڑکی پسند آگئی ہے اور وہ کسی اور کا نام نہیں لینے دیتی۔ دو سال ہوئے اُس کی ماں بھی آکر کہہ گئی

تھی کہ لڑکے کی منگنی کہیں نہ کرنا۔ کل علی اکبر کو ان کی طرف سے خط آیا تھا شاید اگلے مہینے وہ خود آئیں۔"

باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کا ہجوم تھا اور قریباً اسی قسم کے سوالات سلیم کے باپ اور دادا سے پوچھے جا رہے تھے۔ سلیم گھر سے کوئی چیز لینے آیا تو اُس کی بہن زبیدہ نے اُسے دیکھتے ہی دوسری لڑکیوں کو آواز دی۔ "امینہ، صغریٰ، حلیمہ، عائشہ! بھائی جان آگئے۔" اور آن کی آن میں سلیم کی چچازاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد اور ماموں زاد بہنوں نے اُسے گھیر لیا۔ امینہ نے ابتدا کی۔ "بھائی جان! بھابی کب لاؤ گے؟"

"کون سی بھابی؟ چڑیل چپ رہو، نہیں تو مار کھاؤ گی۔"

امینہ نے ہنس کر کہا۔ "دیکھو بھائی جان! مجھے مار لو لیکن بھابی ضرور لاؤ۔"

لڑکیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ سلیم انھیں اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا باہر نکلا۔ صحن میں اس کی ماں نے کہا۔ "سلیم مجھے یاد نہیں رہا، تمھارے دو خط آئے ہوئے ہیں، میں نے تمھاری میز کی دراز میں رکھ دیے تھے۔"

سلیم نے جلدی سے اندر جا کر میز کی دراز سے خط نکالے۔ ایک مختصر سا خط اختر کی طرف سے تھا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں رضا کاروں کی جماعت کے ساتھ بہار جا رہا ہوں۔ اگر تم جانا چاہو تو دو چار دن میں لاہور پہنچ جاؤ۔"

دوسرا خط ناصر کی طرف سے تھا اور یہ کسی قدر طویل تھا۔ سلیم نے جلدی سے آخری صفحہ الٹ کر لکھنے والے کا نام دیکھا اور اسے اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی نیت سے باہر نکل آیا۔ باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کی محفل گرم تھی، اس لیے وہ بیٹھک میں چلا گیا۔ ناصر علی کے خط کا مضمون یہ

www.allurdu.com

تھا :-

میرے پاکستانی بھائی !

میں یہ خط کلکتہ کے ایک ہسپتال سے لکھ رہا ہوں۔ بہار میں آگ اور خون کے طوفان سے گزرنے کے بعد میں یہاں پہنچا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر بیان کر بھی سکوں تو تمھیں یقین نہیں آئے گا۔ تمھیں یہ کیسے یقین آئے گا، کہ دو ہزار انسانوں کی ایک بستی جہاں ایک صبح زندگی کی مسکراہٹیں بیدار ہو رہی تھیں، شام تک راکھ کا ایک انبار بن چکی تھی۔ جہاں سورج کی ابتدائی کرنوں نے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے انسانوں کو دیکھا تھا، وہاں آفتاب کی واپسیں نگاہیں بے گور و کفن لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ سلیم! یہ میرا گاؤں تھا اور یہ صوبہ بہار کی ان سینکڑوں بستیوں میں سے ایک تھا جہاں بچّوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں نے اہنسا اور شانتی کے علمبرداروں کو ان کے اصلی رُوپ میں دیکھا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے کان، ناک، ہاتھ اور دوسرے اعضا کاٹ کر ہماری مسجد کی سیڑھیوں پر سجائے گئے۔ بچّوں کو نیزوں پر اُچھالا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کی عصمت اور عفّت کی دھجّیاں اڑائی گئیں اور باپ اور بھائیوں کو بنوکِ سنگین مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ذلّت اور رُسوائی کا تماشا دیکھیں۔

تم شاید ہمیں بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دو۔ لیکن یقین کرو کہ یہ وہ طوفان تھا، جس کے لیے ہم قطعاً تیار نہ تھے۔ کانگرسی حکومت ہم پر بھیڑیے چھوڑنے سے پہلے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ چکی تھی۔

وہ پولیس جو ہمارے گھروں کی تلاشیاں لے کر چھوٹے چاقو تک ضبط کر چکی تھی، ہندوؤں کو بندوقوں اور پستولوں سے مسلّح کر چکی تھی۔ حکومت اُن کی تھی۔ قانون اُن کا تھا۔ پولیس اُن کی تھی۔ اسلحہ اور بارود اُن کا تھا — ہم کب تک لڑتے اور کہاں تک مقابلہ کرتے؟ وہ خالی ہاتھ جو مدافعت کے لیے اُٹھے، کٹ کر رہ گئے۔ وہ سینے جن میں غیرت اور ایمان تھا، گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ میرے گاؤں کے پانچ سو نوجوانوں نے لاٹھیوں کے ساتھ چار گھنٹے ان بلوائیوں کا مقابلہ کیا۔ جو تعداد میں اُن سے آٹھ دس گنا زیادہ تھے۔ جن میں سے بعض بندوقوں اور پستولوں اور باقی تلواروں اور نیزوں سے مسلّح تھے اور ہم نے انھیں بھگا دیا —— وہ چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ آئے تو اُن کی تعداد دس ہزار تھی اور پولیس کی سنگینیں ان کی رہنمائی کر رہی تھیں —— انھیں فتح ہُوئی لیکن کیا یہ ہماری شکست تھی؟ —— اگر گولیوں کی بارش میں پانچ سو نوجوان دس ہزار حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں اور ان کے بعد بچّوں اور بوڑھوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور بستی کو آگ لگا دی جائے تو کیا اسے مدافعت کرنے والوں کی شکست کہا جائے گا؟ اور پھر اگر کسی بوڑھے باپ کو درخت کے ساتھ باندھ دیا جائے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے وحشت اور بربریّت کے ہاتھوں میں اُس کی نوجوان بیٹیاں تڑپنے، چیخنے اور چلّانے کے بعد ختم ہو جائیں اور پھر اُن کی لاشوں کے ساتھ بھی —— سلیم! میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ انھوں نے مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ میں حیران ہُوں کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔ سُورج

www.allurdu.com

اب تک کیوں طلوع ہوتا ہے۔ ستارے اب تک کیوں چمکتے ہیں؟

یہ خط میں نے تمھیں اس لیے نہیں لکھا کہ تم میرے خاندان اور میرے گاؤں کی تباہی پر اظہارِ افسوس کرو۔ بہار میں ایک خاندان یا ایک بستی تباہ نہیں ہوئی، اب تک قریباً ساٹھ ہزار انسان مارے جا چکے ہیں اور چار لاکھ بے خانماں ہو چکے ہیں لیکن اس قدر تباہی اور بربادی کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی ہندو فاشزم اپنی تمام تخریبی قوتوں کے ساتھ میدان میں نہیں آیا۔ بہار میں ابھی چھوٹے پیمانے پر ایک تجربہ کیا گیا ہے، ابھی تک وہ خنجر جو عدم تشدد کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں، پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے۔ ہندو فاشزم کے آتشیں پہاڑ سے صرف چند چنگاریاں نکلی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ مسلمان ہوشیار ہو جائیں۔ بالخصوص اکثریت کے صوبوں کے مسلمان جن کی قوتِ مدافعت کے ساتھ اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اپنی زندگی اور بقا کی امیدیں وابستہ کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے لیے نہیں تو کم از کم اپنی بقا کی جنگ کے لیے ہی پنجاب کے مسلمانوں کو تیار کرو — اگر بہار کے واقعات کے بعد بھی آپ لوگوں کی آنکھ نہ کھلی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔

ہمارے لیڈروں کی یہ حالت ہے کہ وہ ابھی تک قوم کے ہر درد کے علاج کے لیے اپنا تازہ بیان کافی سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا کو یہ بتا دینا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہندو کیا کر رہا ہے۔ اُس نے اتنے گھر جلا ڈالے، اتنے آدمیوں کو مار ڈالا — دفاعی کمیٹی بنی۔ اس

کے بعد مجلسِ عمل بنی، لیکن ان کی تمام سرگرمیاں بیان بازی تک محدود ہیں۔ خدا کے لیے قوم کے نوجوانوں کو بیدار کرو۔ پانی اب سر کے برابر آ چکا ہے۔

میرے زخم ٹھیک ہو چکے ہیں اور پانچ چھ روز تک میں رضاکاروں کے ایک وفد کے ساتھ بہار جا رہا ہوں۔

تمھارا مخلص

ناصر علی

خط پڑھنے کے بعد سلیم بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھا رہا۔ بیٹھک سے باہر اُسے مردوں اور عورتوں کے قہقہے ناخوش گوار محسوس ہو رہے تھے۔

یوسف ہانپتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا۔ "بھائی جان! میں آپ کو کتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں، آپ کے دوست آئے ہیں۔"

"کون؟" سلیم نے سوال کیا۔

"مہندر سنگھ۔"

"اچھا! انھیں یہاں لے آؤ!"

یوسف بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر میں مہندر سنگھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ سلیم نے اُٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اُسے اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا۔ مہندر سنگھ نے کہا۔ "میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ کل بلونت سنگھ کو آنا تھا اس لیے میں مجید کی برات میں شریک نہ ہو سکا۔"

"آ گیا وہ؟"

"جی ہاں!"

"اسے یہاں کیوں نہیں لائے۔ اس سے ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے!"

"وہ آج صبح اپنی سسرال چلا گیا تھا۔ کل یا پرسوں وہ آپ کے پاس آئے گا!"

"ابھی تک وہ کشمیر کی فوج میں ہے نا؟"

"جی ہاں! اب تو وہ کہتا ہے کہ میں بہت جلد کیپٹن بننے والا ہوں۔"

سلیم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "مہندر چائے پیو گے؟"

"نہیں چائے تو میں پی کر آیا ہوں۔ میں آپ کو یہ کہنے آیا تھا کہ پرسوں اگر آپ کو فرصت ہو تو شکار کو چلیں۔"

"پرسوں تک شاید میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں بہت دُور جا رہا ہوں!"

"آپ کچھ پریشان ہیں؟"

سلیم نے کچھ دیر پریشان رہنے کے بعد کہا۔ "مہندر! الیکشن کے دنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک طالب علم یہاں آیا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ تمہاری ملاقات بھی کرائی تھی۔"

"ہاں! مجھے ابھی تک وہ غزل یاد ہے جو اس نے یہاں سنائی تھی۔ بہت اچھی آواز تھی اُس کی۔"

"وہ بہار کا رہنے والا تھا۔"

مہندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔ "اس کے متعلق کوئی بُری خبر آئی ہے؟"

"اس کا خط آیا ہے۔"

"بہار کے متعلق بڑی افسوسناک خبریں آ رہی ہیں۔ کیا لکھتا ہے وہ؟"

"یہ اس کا خط ہے ——" سلیم نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے پڑھ سکتے ہو۔"

خط پڑھنے کے بعد مہندر کچھ دیر سلیم کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "تو آپ بہار جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کاش میں آپ کے ساتھ جا سکتا —— کاش مجھ جیسے ایک آدمی کی قربانی تباہی اور ہلاکت کے اس طوفان کو روک سکتی —— میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ طوفان کسی دن یہاں بھی آئے گا —— ہندو فاشزم انسانیت کو ختم کرنے کے لیے جو چِتا تیار کر رہا ہے، پنجاب میں میری قوم اس کا ایندھن بنے گی —— بھائی سلیم! اس آگ کو یہاں آنے سے روکیے —— ورنہ پانچ دریا کسی دن سُرخ ہو جائیں گے —— لیکن نہیں۔ آپ اسے نہیں روک سکتے —— اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ میری قوم ان فاشسٹوں کو اپنے گوردوارے استعمال کرنے کی اجازت دے چکی ہے۔ سکھ مسلمانوں کا گھر جلانے کے شوق میں اپنے گھر بھی جلا ڈالیں گے اور ہندو آگ اور تیل مہیا کرنے کے بعد مزے سے تماشا دیکھے گا ——"

سلیم نے کہا۔ "مہندر! جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں، میں پنجاب کا مستقبل اس قدر ہولناک نہیں سمجھتا۔"

"اس وقت مجھ جیسے لوگوں کی آواز کوئی نہیں سُنے گا۔ اس وقت ایسی آواز نکالنے والے آدمی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا ——"

—— ✳ ——

www.allurdu.com

آگ پھیلتی گئی۔ بمبئی اور بہار میں انسانیت کا دامن نوچنے والے ہاتھ یوپی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں غنڈوں اور بلوائیوں کی جو افواج منظم ہو رہی تھیں، انھیں کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی لیکن پنجاب اور سرحد کی وزارتوں نے مسلمانوں کے بازوئے شمشیر زن کو اپنی مصلحتوں کی بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔

پنجاب کے ملت فروش نے اپنے ہندو سرپرستوں کو اور زیادہ مطمئن کرنے کے لیے مسلم لیگ کے رضاکاروں کی جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ بظاہر یہ حکم پنجاب کو پُرامن رکھنے کے لیے دیا گیا تھا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی رہی سہی قوتِ مدافعت کچل کر بھارت کے بھیڑیوں کے لیے میدان صاف کیا جائے۔ اس اقدام کو غیر جانب دارانہ رنگ دینے کے لیے مہاسبھا کے سیوا دل وغیرہ پر بھی پابندیاں عاید کر دی گئیں لیکن کانگرس کے رضاکاروں کو پوری آزادی تھی۔ دوسرے الفاظ میں مہاسبھائی رضاکاروں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے فقط اپنے سائن بورڈ بدل دینے کی ضرورت تھی۔ اس حکم کا عملی نفاذ فقط مسلمانوں تک محدود تھا۔

پنجاب کے مسلمان اس وزارت کا تختہ الٹنے پر مجبور ہو گئے جس نے ان کی اکثریت کے صوبہ میں بھی ان پر اقلیت کو مسلط کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے دفاتر کی تلاشیاں شروع ہوئیں۔ چند لیڈر گرفتار ہوئے۔ دوسروں نے نیک نامی میں حصہ دار بننے کے لیے ان کی تقلید کی۔ چنانچہ چند دن میں ملت کے وہ اکابر جو معمولی غصے کی حالت میں قدرے نرم اور زیادہ غصے کی حالت میں قدرے گرم بیان دے کر ملت کے تمام دُکھوں کا علاج کر دیا کرتے تھے، ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سرپٹ دوڑتے ہوئے جیلوں میں جا پہنچے۔ ان میں سے

کئی بزرگ ایسے تھے جنھوں نے یہ خیال کیا کہ اگر وہ ایک دن لیٹ جیل پہنچے تو شاید لیڈروں کی پچھلی صف میں دھکیل دیے جائیں۔

بظاہر یہ تحریک عمر رسیدہ لیڈروں کی رہنمائی سے محروم ہو چکی تھی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ قیادت متوسط درجہ کے باعمل نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی اور یہ تحریک عوامی تحریک بن گئی۔ قوم خضر حیات خاں اور ان کے سرپرستوں کا چیلنج قبول کر چکی تھی۔ قوم کے فرزند، قوم کی بیٹیاں اور قوم کی مائیں میدان میں آ چکی تھیں۔ باہمت مسلم نوجوان ملت فروشوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر چکے تھے۔ جیلیں بھر چکی تھیں، پولیس کی لاٹھیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ اشک آور گیس کے بم ناکارہ ہو چکے تھے۔ مسلم اخبارات بند تھے لیکن پنجاب میں کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں پولیس کی تمام کوششوں کے باوجود خفیہ تحریک کی طرف سے ہدایات نہیں پہنچتی تھیں۔ خضر اور سچر کے قانون کے مطابق ایک جگہ چار مسلمانوں کا جمع ہونا جرم تھا لیکن کوئی قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں ہزاروں انسانوں کا جلوس نہیں نکلتا تھا۔ پنجاب کا ملت فروش یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنی قوم کو مُردہ سمجھ کر ہندوؤں کے ساتھ اس کی عزت اور آزادی کا سودا کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔

یہی حال صوبہ سرحد کا تھا ——— کانگرس نے درۂ خیبر پر رام راج کا جھنڈا گاڑنے کی نیت سے جس شترِ بے مہار پر سواری کی تھی، وہ دلدل میں پھنس چکا تھا ——— پٹھان کی نگاہوں میں چرخے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

"گورداسپور کی طرف سے آنے والی ایک لاری امرتسر کے اڈے پر آ کر

www.allurdu.com

رکی۔ سلیم اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان جلدی سے اُتر کر پاس ہی ایک دوکان سے لسّی پی رہے تھے کہ کسی نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "چودھری جی! السلام علیکم۔"

سلیم نے مڑکر اس کے سلام کا جواب دیا لیکن وہ اسے پہچان نہ سکا۔

"آج کدھر چڑھائی کی ہے؟"

سلیم اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ "میں لاہور جا رہا ہُوں۔"

"اور میاں محمد صدیق بھی لاہور جا رہے ہیں؟" اس نے سلیم کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں جی میں سیالکوٹ جا رہا ہوں۔" سلیم کے ساتھی نے جواب دیا۔

"بتایئے! میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

سلیم کے ساتھی نے جواب دیا۔ "نہیں آپ کی بڑی مہربانی۔"

پاس ہی سڑک کے دوسرے کنارے امرت سر سے لاہور جانے والی بس کا کلینر پکار رہا تھا۔ "چلو بھئی لاہور ——— موٹر تیار ہے۔" اور سلیم اور صدیق اُس آدمی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد موٹر پر سوار ہو گئے۔

جب موٹر چل پڑی تو سلیم نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "صدیق! یہ کون تھا ———؟"

"یہ کریم بخش حوالدار ہے۔ آپ بھُول گئے۔ الیکشن کے دنوں میں اس نے آپ سے تھوڑا سا جھگڑا کیا تھا۔"

"ارے یار! میں پہچان نہیں سکا۔ اصل میں یہ وردی کے بغیر تھا۔"

صدیق نے کہا۔ "یہ تبدیل ہو کر امرتسر آگیا ہے۔ میرے خیال میں اب سی آئی ڈی میں ہے۔"

"بھئی یوں بھی تو خضر کی پولیس آج کل سفید کپڑوں میں ڈیوٹی دینا زیادہ آسان سمجھتی ہے۔ وہ ہمیں بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔"

لاہور پہنچ کر سلیم نے صدیق سے کہا۔ "تم یہیں اڈے پر رہو۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

تھوڑی دیر بعد سلیم شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا ایک مسجد کے ساتھ پان فروش کی دوکان پر رُکا۔ اس نے دوکاندار کو غور سے دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ "کیوں جی نرگس کے پھول کہاں ملیں گے؟"

دوکاندار نے سر سے لے کر پاؤں تک چند بار اس کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر بولا۔ "میرے ساتھ آیئے!"

سلیم اس کے پیچھے چل دیا۔ دوکاندار گلی کے موڑ پر ایک مکان کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے واپس چلا گیا۔ سلیم نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پانچ مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے اندر سے آواز دی۔ "کون ہے؟"

سلیم نے کہا۔ "مکان نمبر اکیس یہی ہے؟"

ایک نوجوان نے دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا اور سلیم سے پھر سوال کیا۔ "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"اختر صاحب یہاں ہیں؟"

"نہیں! وہ کہیں جا چکے ہیں۔ آپ کا نام سلیم ہے؟"

"جی ہاں! مجھے دس بجے سے پہلے یہاں پہنچنا تھا لیکن موٹر نہ مل سکی۔"

"آپ اندر آجایئے!"

www.allurdu.com

سلیم اندر داخل ہوا تو نوجوان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی چیز ہمارے پاس موجود ہے، آیئے!"

سلیم اس کے پیچھے ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے ایک کونے میں پانچ لڑکے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے سلیم نے اپنی جیب سے چند کاغذات میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں پمفلٹ کے لیے یہ مضمون لکھ کر لایا ہوں۔ اختر صاحب کب واپس آئیں گے؟"

ایک نوجوان نے جو بظاہر اس گروہ کا لیڈر معلوم ہوتا تھا جواب دیا:

"ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کے پمفلٹ کے متعلق وہ ہمیں ہدایت دے گئے ہیں اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ آپ کو ایک سائیکلو اسٹائل مشین دے دی جائے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی مقامی لیگ کے پاس ایک سائیکلو اسٹائل مشین بھی نہیں ہے؟"

"بھئی! ہماری لیگ کے دفتر میں ایک ٹوٹا ہوا حقہ تھا، اب وہ بھی شاید پولیس اٹھا کر لے گئی ہے۔"

"اچھا سلیم صاحب! آپ ہمارے ساتھ کچھ کام کرائیں گے یا جانا چاہتے ہیں؟"

"مجھے آپ حکم دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ میں آج رات واپس پہنچ جاؤں۔ ہمارے علاقے میں پروپیگنڈے کا کوئی انتظام نہیں۔"

دس گیارہ سال کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے کہا۔ "ہم نے بیس ہزار اشتہار چھاپ دیے ہیں۔ بڑی آپا کہتی ہیں، بلیٹن کا مضمون دیں اور کاغذ کا انتظام بھی کیجیے۔"

لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور نوجوان نے سلیم کی طرف متوجہ

بھئی! ہماری بہنوں نے بہت کام کیا ہے۔ یہ ہمیں ایک لمحہ بیکار نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اچھا ہوا آپ کا پمفلٹ آ گیا۔ ہم انھیں چند گھنٹے اور مصروف رکھ سکیں گے —— اچھا آپ جائیں۔ اصغر وہ سوٹ کیس سلیم صاحب کو دے دو لیکن بھائی ذرا احتیاط کرنا۔ آج کل پولیس ان چیزوں کو بم سے زیادہ خطرناک سمجھتی ہے۔ اگر پکڑے جاؤ تو پولیس والوں کو اس جگہ کا پتہ نہ دینا۔ اگر کہو تو تمھارے ساتھ امرتسر تک کسی کو بھیج دیں۔"

سلیم نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک آدمی ہے، میں اسے اڈے پر چھوڑ آیا ہوں۔"

شام کے پانچ بجے سلیم اور اس کا ساتھی موٹر پر دوبارہ امرتسر پہنچے تو کریم بخش حلوائی کی دوکان کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ موٹر سے اترتے وقت صدیق کی نگاہ اچانک اس پر جا پڑی اور اس نے سلیم سے کہا۔ "ارے یار وہ بدمعاش ابھی تک یہاں ہے۔"

"کون؟"

کریم بخش۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔"

سلیم نے کہا۔ "دیکھو صدیق! اگر معاملہ خراب ہو گیا تو میں اس کے ساتھ نپٹنے کی کوشش کروں گا تمھیں اگر سوٹ کیس لے کر بھاگنے کا موقع مل جائے تو میری پروا نہ کرنا۔ امرتسر میں کسی کو جانتے ہو؟"

"میرے یہاں کئی رشتہ دار ہیں۔"

اتنی دیر میں کریم بخش دوکان سے اٹھ کر ان کے قریب آ چکا تھا۔ "چودھری جی! بہت جلد آ گئے آپ لاہور سے۔" [illegible]س نے آتے ہی کہا۔

www.allurdu.com

"جی ہاں! مجھے وہاں کوئی زیادہ کام نہیں تھا۔"

"آج رات میرے پاس ٹھہریں۔"

"مہربانی! لیکن مجھے گھر میں بہت ضروری کام ہے۔"

"کوئی جلسہ ولسہ ہوگا؟"

"ہاں! جلسے بھی تو ہوتے رہتے ہیں۔ اچھّا خدا حافظ! اب دیر ہو رہی ہے۔ کہیں گورداسپور کی موٹر نہ نکل جائے۔"

"موٹریں بہت۔ آپ فکر نہ کریں۔ میاں محمد صدیق، آپ کو تو شاید سیالکوٹ جانا تھا؟"

صدیق کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایک غلطی کر چکا ہے۔ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ "بس جی! میں بھی ان کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔"

کریم بخش نے سلیم سے کہا۔ "صبح شاید آپ کے پاس یہ سوٹ کیس نہیں تھا؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "نہیں، میرا سامان لاہور میں پڑا ہوا تھا۔ صدیق چلو! دیر ہو رہی ہے۔ اچھا حوالدار صاحب! السلام علیکم!"

حوالدار نے کہا۔ "اس اڈّے پر تو کوئی لاری نہیں ہے۔ دوسرے اڈّے پر آپ کو لاری مل جائے گی۔ چلئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں ــــ لائیے! میں اٹھا لیتا ہوں آپ کا سوٹ کیس۔"

"نہیں! مہربانی، یہ بھاری نہیں ہے۔"

صدیق نے کہا۔ "لائیے میں اُٹھا لیتا ہوں۔"

سلیم نے سوٹ کیس صدیق کے ہاتھ میں دے دیا۔ پولیس کا ایک سپاہی سڑک پر لاٹھی لیے کھڑا تھا۔ کریم بخش نے چلتے چلتے مُڑ کر اسے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ اُن کے پیچھے چل پڑا۔ سلیم اُس کی یہ حرکت دیکھ چکا تھا۔ اُس نے جلدی سے سامنے سڑک پر جانے والے کسی آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ارے صدیق! وہ منوّر جا رہا ہے، بلاؤ اس گدھے کو۔" اور صدیق "منوّر! منوّر! ارے منوّر کے بچّے!" کہتا ہوا تیزی سے آگے چل دیا۔ آن کی آن میں صدیق کوئی تیس قدم آگے جا چکا تھا۔

حوالدار اور کانسٹبل پریشانی کی حالت میں سلیم کے قریب کھڑے تھے۔ اچانک کریم بخش سلیم کا بازو پکڑ کر چلّایا۔ "گنڈا سنگھ، بھاگو اُس سُوٹ کیس والے کا پیچھا کرو۔ دیکھو وہ بھاگ رہا ہے۔ سیٹی بجاؤ!"

گنڈا سنگھ سیٹی بجاتا اور لاٹھی ہلاتا ہوا بھاگا لیکن صدیق کی رفتار اس سے بہت تیز تھی۔ رائے عامہ پولیس کے متعلق بیدار ہو چکی تھی۔ ایک ہٹے کٹے نوجوان نے اچانک اپنی ٹانگ آگے کر دی اور گنڈا سنگھ "تیری ماں ــــ" کہہ کر مُنہ کے بل گر پڑا ــــ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ غضب ناک ہو کر اُٹھا۔ سوٹ کیس والے مجرم سے زیادہ اسے ٹانگ پھنسانے والے کی تلاش تھی۔

"کیا ہوا سنتری جی؟" ایک عمر رسیدہ بنیے نے آگے بڑھ کر سوال کیا اور گنڈا سنگھ نے آگے بڑھ کر انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اس کے مُنہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

اتنی دیر میں کریم بخش بھی سلیم کا بازو پکڑے ہوئے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ چلّایا۔ "گنڈا سنگھ بھاگو اس کا پیچھا کرو۔"

گنڈا سنگھ دوبارہ بھاگا لیکن اب اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ صدّیق سامنے مظاہرین کے ایک جلوس میں غائب ہو چکا تھا۔

دو اور کانسٹبل کریم بخش کے پاس پہنچ چکے تھے، اور وہ انتہائی غضبناک

www.allurdu.com

لہجے میں سلیم سے کہہ رہا تھا۔" بابوجی! بتاؤ اس سوٹ کیس میں کیا تھا اور اُسے کہاں بھیجا ہے تم نے ؟"

سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔" تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم ہو کون ؟"

ایک سپاہی نے کہا۔" حوالدار صاحب کے ساتھ ہوش سے بات کرو۔"

"اچھا یہ حوالدار صاحب ہیں ؟"

کریم بخش چلّایا۔" لے چلو اسے تھانے میں۔ اس کے پاس بم تھے۔"

پولیس کی مار پیٹ کے بعد سلیم حوالات میں منہ کے بل پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ تھانیدار اپنے علاقے میں گشت کرنے کے بعد رات کے آٹھ بجے واپس آیا اور دو سپاہی سلیم کو حوالات سے نکال کر اُس کے سامنے لے گئے۔

سلیم کو تھانیدار کی میز کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ سلیم کے دانتوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ تھانیدار نے تھوڑی دیر میز پر پڑے ہوئے کاغذات اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد سلیم کی طرف دیکھا۔ دونوں پہلی نگاہ میں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ سب انسپکٹر منصور علی کالج میں اُس کا ہم جماعت تھا۔ وہ ندامت، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں سلیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلیم کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ چند سیکنڈ قریب پڑی ہوئی کرسی کا سہارا لینے کے بعد فرش پر گر کر بیہوش ہوگیا۔ تھانیدار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ مکر کرتا ہے جی!" ایک سپاہی نے اُسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

تھانیدار نے آگے بڑھ کر اُسے ایک ہاتھ سے دھکّا دیا اور سپاہی دہلیز کے پاس جا گرا اور پھر اُس نے سپاہیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔" گنڈا سنگھ! اس کی پیٹی اتار لو۔ میراں بخش! اس کے لیے پانی لاؤ!"

تھوڑی دیر بعد سلیم کو ہوش آچکا تھا۔ تھانیدار کے حکم سے سپاہیوں نے اُسے برآمدے میں چارپائی پر لِٹا دیا۔

وہ سپاہی جس نے ٹھوکر ماری تھی، پریشانی، اور گنڈا سنگھ جسے اُس کی پیٹی اُتارنے کا حکم ملا تھا، تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

تھانیدار نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔" اسے کس نے مارا ہے؟"

سپاہی گنڈا سنگھ اور میراں بخش کی طرف دیکھنے لگے۔

گنڈا سنگھ بولا۔" جی اس کے پاس بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تھا، ہم نے حوالدار صاحب کے حکم سے اِسے مارا ہے۔"

"اچھا، وہ بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس کہاں ہے ؟"

"جی اُسے ایک اور آدمی لے کر بھاگ گیا ہے۔"

"سوٹ کیس والا بھاگ گیا اور جو خالی ہاتھ تھا، تم اُسے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ یہی بات ہے نا؟"

"جی ہاں!"

"شاباش! تم بہت سمجھ دار آدمی ہو، لیکن اُسے پکڑ کر کیوں نہ لائے جس کے پاس بم تھے، وہ کہاں ہے؟"

"جی اُسی کے متعلق تو ہم پُوچھ رہے تھے اس سے۔ یہ تین دفعہ بیہوش ہوا ہے لیکن نہیں بتاتا کہ وہ سوٹ کیس والا کہاں گیا ہے ؟"

تھانیدار چلّایا۔" لیکن تم نے اُسے کیوں نہیں پکڑا، اپنے اس باپ کو کیوں

www.allurdu.com

پکڑ کر لائے ؟"

"جی میں گر پڑا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔"

"تم نے اُس کا سُوٹ کیس دیکھا تھا؟"

"جی دیکھا تو تھا۔"

"کیا رنگ تھا اُس کا؟"

"شاید سبز تھا"

"تم نے بم دیکھے تھے؟"

"جی نہیں، حوالدار صاحب نے دیکھے ہوں گے۔"

تھانیدار نے گرج کر کہا۔ "حوالدار کہاں ہے؟"

"جی وہ ابھی تھک کر گئے ہیں۔"

"کیسے تھک گیا وہ؟"

"جی ملزم کو پیٹ کر۔ وہ کہتے تھے میں تھک گیا ہوں، ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں۔"

حوالدار داخل ہوا۔ اور اُس نے آتے ہی کہا۔ "جی مجھے بُلایا ہے؟"

"ہاں! تم نے کوتوالی میں مجھے ٹیلیفون کیا تھا کہ تم نے کہیں بم دیکھے ہیں، کہاں ہیں وہ؟"

"جی وہ سوٹ کیس لے کر بھاگ گیا ہے، یہ اس کا ساتھی ہے۔ میں اُسے جانتا ہُوں۔"

"اور تم نے سوٹ کیس میں بم دیکھے تھے؟"

"نہیں! مجھے شک ہے بلکہ یقین ہے۔ یہ صُبح لاہور گئے تھے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔"

تھانیدار نے بات کاٹ کر کہا۔ "کیوں گنڈا سنگھ امرت سر اور لاہور کے درمیان صبح سے شام تک کتنے آدمی سفر کرتے ہیں؟"

"جی ہزاروں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، وہ سب بموں کا کاروبار کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

حوالدار نے کہا۔ "جی اُن کے پاس سُوٹ کیس تھا۔ صُبح جب وہ گئے تھے.. تو...."

تھانیدار نے پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ "اچھا یہ بات ہے۔ کیوں گنڈا سنگھ! اگر امرتسر اور لاہور کے درمیان سفر کرنے والے کسی آدمی کے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھو تو تم اُسے گولی مار دو گے؟"

گنڈا سنگھ نے گھبرا کر کہا۔ "جی، وہ کیوں؟"

"کیونکہ تمہارے حوالدار کا خیال ہے کہ سُوٹ کیس میں بموں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

"جی اگر حوالدار صاحب حُکم دیں تو پھر مجھے گولی چلانی پڑے گی، ورنہ ہر سوٹ کیس میں بم تو نہیں ہوتے۔"

کریم بخش نے کہا۔ "جی! میں آپ کو سارا واقعہ سُناتا ہُوں۔"

تھانیدار نے گرج کر کہا۔ "میں کچھ نہیں سُننا۔ تم نے ایک شخص کو بموں سے بھرا ہوا سُوٹ کیس اُٹھا کر بھاگنے کا موقع دیا ہے۔ اگر یہ درُست ہے تو تم پرلے درجے کے بیوقوف ہو کہ اسے چھوڑ کر دوسرا آدمی پکڑ لائے۔ اگر یہ غلط ہے اور اس شخص کو تم نے بلا وجہ مارا ہے تو بھی میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ ایس، پی شاید یہ بات برداشت نہ کرے کہ امرت سر میں کوئی شخص بموں کا ایک

www.allurdu.com

سوٹ کیس بھر کر لایا ہے اور دو آدمی اُسے پکڑ نہیں سکے۔ تم گنڈا سنگھ کو لے جاؤ اور اسے پکڑ کر لاؤ اور میں ایس پی کو ٹیلیفون کرتا ہوں کہ وہ تمھارے لیے انعام تیار رکھے۔"

کریم بخش ملتجی ہو کر بولا۔ "خان صاحب! ہو سکتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہو لیکن میں انھیں جانتا ہوں، یہ اور اس کا ساتھی دونوں سخت لیگی ہیں —— الیکشن کے دنوں میں ——"

تھانیدار نے کہا۔ "کیوں گنڈا سنگھ، آج شہر میں کتنے مسلم لیگیوں کا جلوس نکلا ہے؟"

"وہ پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔"

"اپنے حوالدار سے کہو، اُن سب پر بم رکھنے کے جرم میں مقدمہ چلائے۔"

"ہاں کریم بخش! اس سوٹ کیس کا رنگ کیا تھا؟"

"جی سیاہ تھا۔"

"کیوں گنڈا سنگھ کیا رنگ تھا اُس کا؟"

گنڈا سنگھ تھانیدار کے تیور دیکھ چکا تھا، وہ بولا۔ "جی میں نے جو سوٹ کیس دیکھا تھا، وہ تو شاید سبز تھا۔"

کریم بخش نے بدحواس ہو کر کہا۔ "خدا کی قسم! سیاہ تھا۔"

تھانیدار نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ "کریم بخش! صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اس سے ذاتی عداوت کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ تم نے بہت زیادتی کی ہے میں سول سرجن کو فون کرتا ہوں۔"

کریم بخش نے کہا۔ "خان صاحب آدمی سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔"

"لیکن آیندہ میں ایسی غلطی برداشت نہیں کروں گا۔ وہ کسی اچھے خاندان کا

معلوم ہوتا ہے۔ اب مجھے تمھاری طرف سے معافی مانگنی پڑے گی۔"

گنڈا سنگھ نے کہا۔ "جی یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی ہے۔ حوالدار صاحب نے اُس کی پیٹھ پر تیس بید مارے ہیں لیکن گالی دینا تو درکنار اُس نے اُف تک نہیں کی۔"

تھانیدار نے کہا۔ "میراں بخش اُسے ویگن میں لٹا دو۔"

رات کے دس بجے پولیس کی ویگن شہر کی ایک گلی میں آکر رکی۔ سب انسپکٹر منصور علی نے نیچے اتر کر ٹارچ کی روشنی میں ایک مکان کا سائن بورڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہی مکان ہے۔"

پھر اس نے سلیم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر موٹر سے اتارا اور کہا:

"چلو تمھیں پہنچا آؤں۔"

"نہیں آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔"

منصور علی نے انگریزی میں کہا۔ "میں تمھارے ساتھ ہوں۔ میں نے پرسوں اس تھانے کا چارج لیا ہے۔ اگر تم یہاں ہوئے تو میں کل یا پرسوں کسی وقت تم سے ملوں گا۔"

جب سلیم اُس کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، منصور نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "ہمت کرو۔ غداروں کا اقتدار دم توڑ رہا ہے —— اچھا خدا حافظ۔ ڈرائیور چلو۔"

موٹر چلی گئی اور سلیم تذبذب کی حالت میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد ڈگمگاتا ہوا مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ "ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!!"

www.allurdu.com

اس نے آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اُس کی نحیف دلاغر آواز ڈیوڑھی اور صحن سے گزر کر سونے کے کمرے تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اچانک اُسے خیال آیا کہ شاید گھر پر کوئی نہ ہو، شاید وہ گاؤں چلے گئے ہوں۔ اس کی ہمّت جواب دے رہی تھی۔ وہ اپنے سر کو جو درد سے پھٹ رہا تھا، دونوں ہاتھوں میں دبا کر دہلیز کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر ہاتھ سے دروازہ ٹٹولنے لگا۔ باہر کی کنڈی کھلی تھی۔ اس نے ہمّت کر کے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

گلی کی دوسری طرف سے کسی نے اپنے مکان کی کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے کہا۔ "کون ہے؟"

سلیم کو یہ آواز بے حد ناخوشگوار محسوس ہوئی۔ اور اس نے بلانے والے کی مداخلت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے آواز دی۔ "ڈاکٹر صاحب!"

پڑوسی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب گرفتار ہو گئے ہیں۔" سلیم کا دل بیٹھ گیا۔

پڑوسی نے پھر کہا۔ "بھئی اگر گھر والوں سے کوئی کام ہے تو گھنٹی بجاؤ۔"

سلیم کو اب تک گھنٹی کا خیال نہیں آیا تھا۔ اُس نے تاریکی میں ہاتھ مارنے کے بعد گھنٹی کا بٹن دبایا اور دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر انتظار کرنے لگا۔ قریباً ایک منٹ کے بعد اُسے مکان کے اندر چند مانوس آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اُس نے دوبارہ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کسی نے ڈیوڑھی میں بجلی کی بتّی جلائی اور دروازے کی دراڑ اور روزن سے روشنی نمودار ہونے لگی۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

سلیم نے نحیف آواز میں کہا۔ "میں ہوں، سلیم!"

ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور راحت نے باہر جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"بھائی جان آپ؟ اس وقت؟"

سلیم جواب دیے بغیر لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے دوسرے سرے پر راحت کی ماں اور اس کے پیچھے عصمت کھڑی تھی۔ اچانک راحت کو سلیم کے قمیض اور کوٹ پر خون کے دھبّے اور چہرے پر ضربوں کے نشان دکھائی دیے۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کرتی ہوئی چلّائی۔ "امّی جان! یہ زخمی ہیں؟"

ماں نے آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! کیا ہوا تمھیں؟"

سلیم نے اپنی نیم وا آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں پولیس کے قابو آ گیا تھا۔"

ماں نے کہا۔ "چلو بیٹا۔ اندر چلو!"

سلیم نے کہا۔ "چلیے میں ٹھیک ہوں۔ یوں ہی چکر آ گیا تھا۔" معاً سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر گردن جھکالی —— عصمت جو ابھی تک چند قدم دور بے حس و حرکت کھڑی تھی، اچانک آگے بڑھی۔ "امّی! یہ بیہوش ہو رہے ہیں!" یہ کہتے ہوئے اُس نے سلیم کا دوسرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سلیم جیسے خواب کی حالت میں کہہ رہا تھا۔ "میں ٹھیک ہوں، آپ فکر نہ کریں یونہی چکر آ گیا تھا۔ اس نے میرے سر پر ٹھوکریں ماری ہیں۔"

عصمت اور اس کی ماں اُسے سہارا دے کر کمرے میں لے گئیں اور وہ بدستور کہہ رہا تھا۔ "آپ چھوڑ دیں، آپ چھوڑ دیں، آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! لیٹ جاؤ یہاں!"

اس نے گردن اُٹھائی۔ بستر کی طرف دیکھا اور بے اختیار مُنہ کے بل اس پر گر پڑا۔

www.allurdu.com

عصمت نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے منہ پر دوائی لگاتے ہوئے کہا۔" امّی! یہ پولیس والے بالکل قصاب بن گئے ہیں۔ دیکھیے! یہ بیدوں کے نشان ہیں۔ راحت جلدی سے پانی گرم کرو۔ سر کے زخم پر خون جم گیا ہے۔"

جب عصمت اُس کے سر پر گرم پانی سے ٹکور کر رہی تھی، سلیم نے آنکھیں کھولیں۔ عصمت کی ماں نے جھک کر پوچھا۔" کیوں بیٹا اب طبیعت کیسی ہے؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

عصمت نے جھجکتے ہوئے کہا۔" امّی جان انھیں بولنے سے تکلیف ہوتی ہے۔"

ماں نے مسکرا کر کہا۔" بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!"

عصمت نے زخم پر پھاہا رکھ کر پٹی باندھی اور اس کے بعد میز سے گلاس اُٹھا کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" یہ پی لیجیے!"

سلیم نے اُٹھ کر گلاس پکڑ لیا اور متذبذب سا ہو کر عصمت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی ماں نے کہا۔" پی لو بیٹا!"

"سارا؟" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

راحت بولی۔" یہ دوا نہیں، پانی اور گلوکوز ہے۔"

میٹھے پانی کا گلاس پینے کے بعد سلیم نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کب گرفتار ہوئے تھے؟"

عصمت کی ماں نے کہا۔" پولیس انھیں کل شام پکڑ کر لے گئی۔ وہ مظاہرہ کرنے کے لیے باہر کے دیہات سے پانچ سو آدمیوں کا جلوس لے کر شہر میں داخل

ہوئے تھے۔ ہمارا نوکر بھی ان کے ساتھ گرفتار ہو گیا ہے۔"

"میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ اب آپ آرام کریں۔"

"بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے۔ میں تم سے سب باتیں صبح پوچھوں گی — اب تم آرام کرو۔ ڈاکٹر صاحبہ مجھے گھور رہی ہیں۔"

ساتھ والے کمرے سے امجد آنکھیں ملتا ہوا آیا اور بستر پر سلیم اور اس کے گرد اپنی ماں اور بہنوں کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔" بھائی جان کو کیا ہوا؟" وہ بولا۔

"کچھ نہیں، چلو بیٹا سو جاؤ۔"

"نہیں امی جان! پہلے بتائیے نا بھائی جان کو کیا ہوا ہے؟"

"آؤ بتاتی ہوں۔" ماں اُسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

راحت نے کہا۔" بھائی جان! اب آپ کے سر میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں، آپ آرام کریں۔"

عصمت نے راحت کو اشارے کے ساتھ کچھ سمجھایا اور اس نے کہا۔

"بھائی جان! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپا جان کا خیال ہے کہ آپ کو ایک انجکشن دے دیا جائے۔"

ماں نے دوسرے کمرے سے کہا۔" ہاں بیٹی! انجکشن ضرور دے دو۔"

سلیم نے کہا۔" ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں۔"

عصمت نے اپنے باپ کے تھیلے سے انجکشن لگانے کا سامان نکالا۔ پانی ابال کر پچکاری کو صاف کیا۔ دوا بھری۔ راحت، سلیم کی قمیص کی آستین اُوپر چڑھا کر سپرٹ لگا رہی تھی کہ ماں نے آواز دی۔" بیٹی! ذرا احتیاط کرنا۔"

www.allurdu.com

عصمت ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی، سکول کے اس بچے کی طرح جو امتحان دینے کے لیے جا رہا ہو، اس کا دل دھڑک رہا تھا ــــ سلیم نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عصمت نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اچانک سوئی بازو میں اتار دی اور راحت نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ انجکشن لگانے کے بعد عصمت نے راحت کی طرف مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

ماں نے دروازے میں آ کر کہا۔ "کیوں بیٹی لگا دیا انجکشن؟"

اُس کے منہ سے حیا میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ "جی ہاں!"

امجد اپنی چارپائی سے اُٹھا اور نظر بچا کر دبے پاؤں چلتا ہوا راحت کے پاس آ پہنچا۔ "آپا! ان کو کیا ہوا ہے؟"

ماں نے کہا۔ "دیکھو بے ایمان، میں سمجھی تھی یہ سو گیا ہے۔ چلو بیٹی جب تک تم یہاں ہو اسے نیند نہیں آئے گی۔"

وہ دوسرے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئیں۔ سلیم دیر تک جاگتا رہا۔ قدرت اُسے اس کی توقع کے خلاف یہاں تک لے آئی تھی۔ اب اُسے پولیس کے ڈنڈوں کا کوئی افسوس نہ تھا۔ عصمت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھے تھے، اور اس کے نزدیک اُن زخموں کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی ــــ اُس کے کانوں میں وہ میٹھی اور دلکش آواز گونج رہی تھی۔ وہ ان کانپتے ہوئے خوبصورت ہاتھوں کا تصور کر رہا تھا، وہ اُن آنکھوں کا تصور کر رہا تھا جن میں محبت کے دریا موجزن تھے اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ حسین چہرہ آ رہا تھا جس میں دودھ شہد اور گلاب کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

صبح کے وقت راحت نے سلیم کے بستر کے قریب تپائی پر چائے اور ناشتہ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! چائے پی لیجیے۔ ابھی ڈاکٹر صاحبہ تشریف لانے والی ہیں۔"

سلیم نے پوچھا۔ "راحت تمھاری آپا ڈاکٹر کب سے بن گئیں؟"

راحت نے دروازے سے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی سلیم کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بھائی جان! آپ کو معلوم نہیں؟ آپا جان تو اس شہر کی بہت مشہور ڈاکٹر ہیں۔ انھیں نزلے اور زکام کا علاج آتا ہے۔ کھانسی کی گولیاں مفت تقسیم کرتی ہیں۔ گلی کے بچوں کی آنکھوں میں دوائی بھی ڈال دیتی ہیں۔"

امجد نے اندر داخل ہو کر کہا۔ "بھائی جان! آپا جان سے آنکھوں میں دوائی نہ ڈلوانا۔ بہت لگتی ہے۔ کان کے درد کو بھی اُن کی دوائی سے کوئی آرام نہیں آتا۔"

عصمت شرماتی اور جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، امجد اُس کے تیور دیکھ کر دوسرے دروازے سے صحن کی طرف نکل گیا۔ راحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسّم لاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب مبارک ہو! آپ کا علاج کامیاب ہے۔"

عصمت کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی اور وہ ایک نظر سلیم کی طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" سلیم نے جواب دیا۔

راحت بولی۔ "اجی اتنے مشہور ڈاکٹر کا علاج ہو اور آپ ٹھیک نہ ہوں،

www.allurdu.com

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

عصمت نے گھور کر راحت کی طرف دیکھا۔ "بڑی چڑیل ہو تم؟"

"ڈاکٹر بننا بُری بات تو نہیں۔" سلیم نے کہا۔

عصمت نے کہا۔ "جی یہ مذاق کرتی ہے۔ میں نے میٹرک کے بعد فسٹ ایڈ سیکھی تھی اور انھوں نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا۔"

سلیم نے کہا۔ "بہرحال مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ایک اچھے ڈاکٹر سے مجھے اس سے بہتر علاج کی توقع نہ تھی۔"

"جی مجھے ابّا جان نے چند دوائیاں بتا دی ہیں۔"

عصمت کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے سلیم کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! میں تمھیں پچھلے پہر دیکھنے کے لیے آئی تھی، تم سو رہے تھے۔ اب طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم یہاں پولیس کے ہاتھ کیسے آ گئے بیٹا؟"

عصمت اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن ماں کا یہ سوال سُن کر وہ دروازے کے قریب رُک گئی ــــ ماں نے کہا۔ "بیٹی بیٹھ جاؤ۔" اور وہ جھجکتی ہوئی کمرے کے کونے میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلیم نے مختصراً اپنی سرگذشت سنا دی۔

عصمت کی ماں نے کہا۔ "بیٹا! یہ وزارت کب ختم ہو گی؟"

سلیم نے جواب دیا۔ "یہ ہماری ہمّت پر منحصر ہے۔ میرے خیال میں اگر مسلمانوں کا یہی جوش و خروش رہا تو موجودہ حکومت دو ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکتی۔"

ماں بولی۔ "ارشد کے ابّا کا بھی یہی خیال تھا۔"

تیسرے دن سلیم وہاں سے یہ احساس لے کر رُخصت ہو رہا تھا کہ عصمت اُس کے دل و دماغ اور روح کی پرواز کا مرکز بن چکی ہے۔ اس نے اس کے ساتھ بہت کم باتیں کی تھیں اور شائد کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو اس کے دل کی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی۔ تاہم سلیم نے ہر لفظ کے ساتھ اس کے سادہ اور معصوم دل کی دھڑکنیں سنی تھیں۔ وہ ان جھکی جھکی اور شرمائی ہوئی نگاہوں کو دیکھ چکا تھا جو کہہ رہی تھیں۔ "میں تمھاری ہوں۔ میں روزِ ازل سے تمھاری ہوں اور تم میرے ہو، ہمیشہ کے لیے میرے!"

عصمت کی ماں نے رُخصت کے وقت سلیم کو ایک لفافہ دے کر تاکید کی تھی کہ وہ اُسے اپنی ماں کے سوا کسی کو نہ دکھائے اور سلیم دیکھے بغیر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس خط کا اس کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے ۞

———— ✳ ————

یونینسٹ وزارت کے ہندو سرپرستوں کا خیال تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کا جوش و خروش ہنگامی ہے اور اسے پولیس کی لاٹھیوں سے ٹھنڈا کرنے کے بعد شمال مغرب میں ہندو فاشزم کی یلغار کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ مسلم لیگ نے کسی منظم پروگرام اور تیاری کے بغیر یہ تحریک چلائی ہے اور جس طرح انگریز نے کئی بار اگلی صف کے لیڈروں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر کے کانگرس کی بڑی سے بڑی تحریک کو ٹھنڈا کر دیا تھا، اسی طرح مسلم لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پنجاب بھی خضر وزارت کے خلاف مُسلم عوام کا مورچہ ٹوٹ جائے گا لیکن حالات

www.allurdu.com

نے ثابت کر دیا کہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا لیڈروں کی جماعت کی تحریک نہ تھی۔ خضر نے ہندو مقاصد کی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ کر پنجاب کے مسلم جمہور کو چیلنج دیا تھا اور اس چیلنج کے بعد اسے معلوم ہوا کہ لیگ اور پنجاب کے ننانوے فی صدی مسلمان ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ اجتماعی خطرہ اجتماعی قوتِ مدافعت کو بیدار کر چکا تھا اور کرائے کے وہ ٹٹو جنھیں ہندو نے وزارت کا توبرا دکھا کر اقتدار کے رتھ میں جوت لیا تھا اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ دلدل میں پاؤں رکھ چکے ہیں۔

پاکستان کے نعرے کو جو تقویت برسوں میں حاصل نہ ہوئی تھی، وہ اس چونتیس دن کی عملی جدوجہد میں حاصل ہو چکی تھی۔ بالآخر خضر حیات خان کانگرس کے رتھ سے اچانک اپنا رسّا تڑا کر بھاگا اور گورنر نے مجبوراً مسلم لیگ کے لیڈر کو تشکیلِ وزارت کی دعوت دی لیکن کانگرس اس صورتِ حالات کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ مکڑی جس نے برسوں کی محنت سے مکر و فریب کے سنہری تاروں کا جال تیار کیا تھا، منہ میں آیا ہوا شکار جاتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ ہندو ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں اس لیے حکمران تھا کہ وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہندو مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس لیے برسرِ اقتدار رہنا چاہتا تھا کہ وہاں بعض ماؤں نے ملّت فروشوں کو جنم دیا تھا۔ اب ہندو اس لیے برہم تھا کہ پنجاب کی مسلم اکثریت اس کے تسلط سے آزاد ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک پنجاب میں مسلم اکثریت کی نمایندہ وزارت کا قیام پانچ دریاؤں کی سرزمین کے عملی طور پر پاکستان میں شامل ہو جانے کے مترادف تھا، اس لیے پنجاب میں بھی کانگرس کو اپنا قدیم چولا تبدیل کرنا پڑا۔ مسلمان یہاں بھی عدم تشدد کے علمبرداروں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ رہے تھے۔ کانگرسی

فاشزم اپنے قدیم ہتھیار بے کار دیکھ کر نئے حربوں کے ساتھ میدان میں آچکا تھا۔ گاندھی کی آتما تارا سنگھ کی زبان سے بول رہی تھی۔ "ہندوؤ اور سکھو! تمھارے امتحان کا وقت آچکا ہے۔ جاپانیوں اور نازیوں کی طرح تباہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہماری ماتر بھومی خون کے لیے پکار رہی ہے۔ ہم خون کے ساتھ اس کی پیاس بجھائیں گے۔ ہم نے مغلستان کو ختم کیا تھا اور ہم پاکستان کو پاؤں تلے روندیں گے۔ ہم زندہ رہیں یا مر جائیں لیکن پنجاب میں مسلمانوں کا اقتدار قبول نہیں کریں گے۔"

ڈاکٹر گوپی چند کہہ رہا تھا۔ "ان دنوں ایسے مظاہرے کرو کہ ہم میں سے کوئی بھگوڑا بن کر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔"

ہندو اور سکھ پریس بیک زبان چلّا رہا تھا۔ "ہم ایسے حالات پیدا کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں جن کے باعث پنجاب میں لیگی وزارت کا قیام ناممکن ہو جائے۔"

چنانچہ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے۔ کانگرس، سکھوں اور سنگھیوں کی قوت کے بل بوتے پر اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ کو پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور سکھوں کے متحدہ محاذ کا لیڈر بنایا گیا۔ اس نے پنجاب اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی کرپان بے نیام کی اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ گاندھی کے امن پسند چیلے سکھوں کی تیاریوں کے پیشِ نظر پنجاب میں بہار کی تاریخ دہرانے کے متعلق پر امید تھے لیکن ان کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ ماسٹر تارا سنگھ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکا کہ "سکھ پنجاب سے مسلمانوں کو نکال کر دم لیں گے۔" ماسٹر تارا سنگھ کے سورما اٹک تک پہنچے بغیر دم نہ لینے کا عہد کر کے میدان میں آئے تھے لیکن بھارت کے بیٹے حیران تھے کہ امرتسر

www.allurdu.com

اور لاہور کے بازاروں میں نہتّے مسلمان ان سُورماؤں کی کرپانیں چھین رہے ہیں ـــــ راولپنڈی، ملتان اور دوسرے شہروں میں بھی وہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکے۔

سکھوں کا سب سے بڑا محاذ امرتسر تھا ـــــ امرتسر کے گوردوارے اور مندر ان افواج کے بارود خانے تھے جو پنجاب کے مسلمان کے ذہن سے پاکستان کا تصوّر مٹانے کے لیے میدان میں آنے والی تھیں لیکن ان فوجوں کی کامیابیاں مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کو جلانے اور عورتوں اور بچّوں کو قتل کرنے تک محدُود رہیں۔ امرتسر کے مسلمانوں نے اچانک حملے کے باعث شروع میں کافی نقصان اُٹھایا۔ سکّھوں نے نہتّے راہ گیروں پر بندوقوں اور پستولوں سے نشانہ بازی کی مشق کی۔ بچوں اور عورتوں پر اپنی کرپانوں کی دھار کی تیزی آزمائی لیکن جب باہمّت نوجوانوں کا ایک گروہ میدان میں آ گیا تو یہاں بھی لاہور اور دُوسرے شہروں کی طرح یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ سفّاکی اور بُزدلی ایک ہی بُرائی کے دو نام ہیں۔

پنجاب کے مسلمان زیادہ دیر خاموش تماشائیوں کی حیثیت میں سکّھوں اور ہندوؤں کو اپنے گھر جلانے کی اجازت نہ دے سکے۔ اُنھوں نے ان کرپانوں کو چھیننے کی کوشش کی جو رام راج کے قیام کے لیے بے نیام ہوئی تھیں۔ اس لیے کانگرس کی نظر میں وہ مُفسد تھے۔ انھوں نے اکالی دل، سیوادل اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے سُورماؤں کو بچّوں، بوڑھوں اور عورتوں کے قتلِ عام سے روکا لہٰذا وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست تھے۔ اُن کی قوّتِ مدافعت نے کانگرس کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ وہ سکھوں کی قوّت کے بل بوتے پر پنجاب کو اکھنڈ ہندوستان میں شامل کر سکتی ہے۔ اس لیے کانگرس جو ہندُوستان کے تقسیم ہو جانے کو

گائے کے دو حصّوں میں کٹ جانے کے مترادف قرار دے چکی تھی، اب پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر رہی تھی ـــــ اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ بنگال اور آسام کو بھی تقسیم کروانا چاہتی تھی ـــــ اور اس تقسیم کے لیے کانگرس کے یہ دلائل تھے کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں کرتے تو مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کے علاقوں کی ہندو اکثریّت کو بھی پاکستان میں مسلم اکثریت کے ماتحت رہنا گوارا نہیں۔ ہندو اور دوسری اقلیّتوں کے جان و مال اور تہذیب و تمدّن کے تحفّظ کے لیے ان صوبوں کی تقسیم ضروری ہے۔

ہندوستان کے نئے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو کانگرس کا یہ استدلال پسند آ گیا۔ اس لیے ۳ جون کے اعلان کے مطابق ان صوبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ آسام کے ضلع سلہٹ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے ریفرنڈم تجویز ہُوا۔

—— ✳ ——

یہ کہنا غلط ہو گا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم فسادات کا نتیجہ تھی۔ فسادات بہار، یو۔ پی اور ہندوستان کے دُوسرے صوبوں میں بھی ہوئے تھے، اور ان صوبوں میں ایسے علاقے بھی تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریّت تھی، اگر مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے ہندو کو پاکستان کی مسلم اکثریت سے خطرہ تھا تو بہار، یو پی اور دوسرے صُوبوں میں مسلمانوں کو ہندو اکثریّت سے کم خطرہ نہ تھا۔ اگر پنجاب اور بنگال کے دو کروڑ غیر مسلموں کو پاکستان کے وسیع اور زرخیز علاقے کاٹ کر دیے جا سکتے تھے، تو ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی ہندوستان کے بعض حصّوں

www.allurdu.com

پر اپنا حق رکھتے تھے۔ اگر ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے تقسیم ہوتی تو دس کروڑ مسلمان ایک چوتھائی سے زیادہ کے حق دار تھے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یوپی، بہار اور آسام کے کچھ حصّے پاکستان میں شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان کے جنوب میں بھی مسلمانوں کی ایک پاکٹ بنتی تھی۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہندو اور انگریز کی سازش نے ایسا نہ ہونے دیا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی تھی' اور وہ اس بے انصافی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ قدرت انھیں یہ سبق دینا چاہتی تھی کہ وہ قوم جو بے انصافی اور بد دیانتی کے خلاف لڑنے کی ہمّت نہیں رکھتی، دیانت اور انصاف کی مستحق نہیں سمجھی جاتی ــــ مسلمانوں نے آزاد وطن کی تمنّا کی تھی۔ انھوں نے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا اصول پیش کیا تھا۔ اُن کے لیڈروں نے پاکستان کے حق میں دلائل دیے تھے، نعرے لگائے تھے، تقریریں کی تھیں، وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان، انگریز، کانگرس اور اُن کے درمیان منطق کی ایک گتھی ہے، اور جب یہ سلجھ جائے گی، پاکستان انھیں مل جائے گا لیکن بہت کم ایسے تھے جنھیں یہ احساس تھا کہ تاریخ کی بعض گتھیاں قلم اور زبان سے زیادہ نوکِ شمشیر کی محتاج ہوتی ہیں۔

مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس نے اس نامصفانہ فیصلے کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری نہیں کی تھی ــــ مسلم لیگ کے سپاہی بدقسمتی سے ابھی تک لکڑی کے گھوڑوں پر سوار تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں نے ڈیڑھ سو برس قبل ہندوستان کے راجوں اور نوابوں سے سودا بازی کی بدولت انگریزی سامراج کی داغ بیل ڈالی

تھی۔ اب یہ سامراج اپنا بوریا بستر باندھنے سے پہلے ہندو سرمایہ داروں سے سودا کر رہا تھا۔ فرنگی طبیب کسی راجے یا نواب کا علاج کرنے کے بعد اُس کی ریاست میں اپنی قوم کے لیے تجارتی مراعات حاصل کیا کرتے تھے اور مونٹ بیٹن وہ جرّاح تھا جو انگریز تاجر اور ہندو مہاجن میں ناطہ جوڑنے کے لیے لاکھوں مُسلمانوں کی شاہ رگ کاٹ چکا تھا۔ مسلم لیگ کی آنکھیں بند نہ تھیں' وہ اس نشتر کو دیکھ رہی تھیں لیکن اس کے پاس وہ ہاتھ نہ تھے جو لارڈ مونٹ بیٹن کا نشتر پکڑ لیتے ــــ! مسلم لیگ مجبور تھی کہ اس نشتر کا چرکا برداشت کرے لیکن مونٹ بیٹن اور ہندو کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ زخم ان کی توقع سے کہیں زیادہ گہرا ہوگا ــــ اور مونٹ بیٹن کی ناانصافی کے بعد ریڈ کلف کی بد دیانتی تاریخِ انسانیت کے سب سے المناک حادثے کا باعث بن جائے گی۔